18
ختم نبوتؐ
آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shaheedmutahhari.com
Presented by Ziaraat.Com

نام کتاب	ختم نبوت
مصنف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
ترتیب وتصحیح	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور۔فضل عباس سیال
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

''شہید مطہری فاؤنڈیشن'' دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور انٹرنیٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھر پور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ختم نبوت'' شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔نبوت، شخصی اور انفرادی پہلو سے ایک فرد انسانی کی روحانی شخصیت کی وسعت کا نام ہے اور عمومی و اجتماعی پہلو سے نبوت کا مطلب عالم انسانیت کیلئے ایک ایسا پیام الٰہی ہے جو اس کی رہنمائی کی خاطر ایک منتخب شخصیت کے ذریعہ بھیجا گیا ہے۔یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے عقیدہ ختم نبوت سے متعلق مختلف سوالات سامنے آتے ہیں۔ قارئین حضرات اس کتاب سے بھر پور استفادہ کریں۔

معراج کمپنی'' کے پلیٹ فارم سے کتاب ھذا مؤمنین کی خدمتِ اقدس میں پیش کی جا رہی ہے۔ادارہ نے کتاب ھذا کی اشاعت میں پوری توجہ سے کام لیا ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی ہمدردانہ آراء ہمارے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ہمیں توقع ہے کہ حسبِ سابق آپ ہماری اس مفید علمی پیشکش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

فہرست مضامین

❁❁❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نبوت

دین اسلام کا ظہور اس کے ابدی ہونے اور سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کا اعلان دونوں کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔

مسلمانوں نے ختم نبوت کو ہمیشہ ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا ہے ان کے سامنے یہ سوال کبھی نہیں آیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر بھی آئے گا یا نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کا بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی کئی بار اس کا اعادہ کیا ہے مسلمانوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کے ظہور کے خیال کو خدا کی وحدنیت یا قیامت کے انکار کے مشابہ او ایمان کے منافی سمجھا گیا ہے۔

مفکرین اسلام نے ختم نبوت کے مسئلے پر اگر کوئی تحقیقی عملی کاوش کی ہے تو اس کا مقصد گمراہ کن خیالات کی بیخ کنی کرنا اور عقیدہ ختم نبوت کو زیادہ سے زیادہ واضح اور روشن کرنا رہا ہے۔

یہاں ہم وحی و نبوت کی ماہیت پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وحی ایک ایسی راہنمائی کا نام ہے جو غیب وملکوت کے ساتھ ضمیر کے ربط واتصال سے حاصل ہوتی ہے۔ نبی تمام انسانی اور عالم غیب سے ربط و تعلق کا ایک وسیلہ ہے درحقیقت وہ عالم انسانیت اور جہان غیب کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نبوت، شخصی اور انفرادی پہلو سے ایک فرد انسانی کی روحانی شخصیت کی

وسعت کا نام ہے اور عمومی واجتماعی پہلو سے نبوت کا مطلب عالم انسانیت کیلئے ایک ایسا پیام الٰہی ہے جو اس کی رہنمائی کی خاطر ایک منتخب شخصیت کے ذریعہ بھیجا گیا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے عقیدہ ختم نبوت سے متعلق مختلف سوالات سامنے آتے ہیں۔ کیا خاتم النبیینؐ کے بعد کسی دوسرے نبی کے ظاہر نہ ہونے اور سلسلہ نبوت کے ختم ہوجائے سے روحانی ومعنوی پہلوؤں سے انسانیت کو کسی تنزل کا سامنا کرنا پڑا ہے؟ کیا مادرِ زمانہ ایسے ملکوتی صفات فرزندوں کو جنم دینے سے عاجز ہو چکی ہے جو عالم غیب وملکوت سے رشتہ رکھتے ہوں؟ کیا ختم نبوت کا اعلان کرنے کا مطلب فطرت کا بانجھ ہوجانا اور ایسے عالی مرتبت فرزندوں کو وجود میں لانے کی صلاحیت سے اس کا محروم ہوجانا ہے؟

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کے پیغام کا محتاج ہے اس کی یہ ضرورت ہی سلسلہ نبوت کے آغاز کا سبب بنی۔ ماضی میں مختلف زمانوں اور ادوار کے تقاضوں کے مطابق پیغام الٰہی کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ پیغمبروں کا پے در پے آنا شریعتوں کی مسلسل تجدید اور کتب آسمانی کا یکے بعد دیگرے نزول اس لئے ہوا کہ ہر دور میں انسان کی ضروریات میں تغیر آتا رہا ہے اور انسان کو ہر زمانے میں ایک نئے پیغام اور ایک نئے پیغمبر کی ضرورت رہی ہے۔ جب یہ صورت ہے تو کس طرح یہ بات فرض کیا جاسکتی ہے کہ ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی یہ رابطہ یک دم منقطع ہو گیا ہے اور وہ پل کہ جس نے عالم انسانیت کو عالم غیب کے ساتھ جوڑ رکھا تھا وہ یک بیک ڈھ گیا ہے، اس کے بعد اب کوئی الٰہی پیغام انسانیت کی طرف نہیں بھیجا جائے گا تو کیا انسانیت کو فرائض اور ذمہ داریوں کے بغیر یونہی آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نوحؑ، ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ جیسے صاحب شریعت پیغمبروں کے درمیان زمانوں میں کچھ دوسرے پیغمبروں کا سلسلہ

بھی موجود رہا ہے اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے پیغمبر اپنے سے پہلے کی شریعت کو نافذ کرنے اور پھیلانے کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔نوح علیہ السلام کے بعد ہزاروں انبیاء آئے ان انبیاء نے نوح علیہ السلام کی شریعت کو نافذ کیا اور پھیلایا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بھی ایسا ہی بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ شریعت اسلام کی آمد کے ساتھ ہی شریعت لانے والی نبوت اور شریعتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد تبلیغی نبوتوں کا سلسلہ کیوں منقطع ہوگیا، جب کہ ماضی میں ہر شریعت کے نازل ہونے کے بعد بے شمار پیغمبر ظاہر ہوتے رہے اور سابق شریعت کی تبلیغ ترویج اور نگہبانی کا فرض ادا کرتے رہے لیکن اسلام کی آمد کے بعد اس طرح ایک پیغمبر بھی ظاہر نہ ہوا؟

یہ ہیں وہ سوالات جو عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔

ختم نبوت کا عقیدہ اسلام نے پیش کیا ہے اور وہی اس کا جواب بھی دیتا ہے اسلام نے ختم نبوت کا عقیدہ کو ایک ایسے جامع فلسفہ کی صورت میں پیش کیا ہے کہ ذہنوں میں کوئی شک وابہام باقی نہیں رہتا۔

اسلام کی رو سے ختم نبوت کا عقیدہ نہ انسانیت کے تنزل کی علامت ہے اور نہ انسانی صلاحیت کے نقصان کی اور نہ مادر زمانہ کے بانجھ ہوجائے کی اور نہ یہ عقیدہ اس بات کی دلیل ہے تقاضوں کے مطابق کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔اسلام اس بارے میں ایک دوسرا ہی فلسفہ اور توجیہ پیش کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اسلام نے خود ختم نبوت کے بارے میں کیا کہا ہے اس کے بعد ان سوالات کو جواب تلاش کرنا چاہیے ،سورہ احزاب کی آیت 40 میں ہم پڑھتے ہیں:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيّٖنَ ؕ

محمد تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے لیکن وہ اللہ کا رسول اور انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبیین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

خاتم کا لفظ عرب لغت کے اعتبار سے ایک ایسی چیز کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کے سلسلے کو ختم کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہے اس لئے اس مہر کو خاتم کہتے ہیں جو خط بند کرنے کے بعد لفافے پر لگائی جاتی ہے۔رواج کے مطابق انگشتری کے نگینے پر نام یا دستخط کندہ ہوتے ہیں اور وہی خطوط پر ثبت کئے جاتے ہیں اسی لئے انگشتری کو خاتم کہا جاتا ہے۔

قرآن میں جہاں کہیں اور جس صورت میں بھی ''ختم'' کا مادہ استعمال کیا گیا ہے۔ختم کرنے یا بند کرنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ سورہ یٰسین کی آیت 65 میں آیا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٦٥

آج ہم ان کے منہ پر مہر لگاتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کرتے ہیں اور ان کے پیر جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس پر گواہی دیتے ہیں۔

زیر بحث آیت کا انداز خود یہ بتاتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے پیغمبر اسلام پر سلسلہ نبوت کا ختم ہونا مسلمانوں کے درمیان ایک مسلمہ امر کی حیثیت رکھتا تھا۔مسلمان جس طرح محمد ﷺ کو خدا کا رسول سمجھتے تھے اس طرح ان کے خاتم النبیین ہونے پر بھی یقین رکھتے تھے۔آیت صرف یہ یاد دلاتی ہے کہ محمد ﷺ کو کسی کے باپ کی حیثیت

سے نہ پکارو بلکہ حقیقی خطاب رسول اللہ اور خاتم النبیین سے آپ کو مخاطب کرو۔

یہ آیت عقیدہ ختم نبوت کے اصل جوہر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔سورہ حجر کی آیت 9 میں اس طرح آیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾

ہم نے خود اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں قرآن کو کسی طرح بھی تحریف وتغییر اور ضیاع سے محفوظ رکھنے کا وعدہ جس قطعیت کے ساتھ کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

نئے نئے پیغمبروں کی آمد اور رسالت کی تجدید کے اسباب سے ایک بڑا سبب انبیاء کی لائی ہوئی مقدس کتابوں اور تعلیمات میں لوگوں کی جانب سے کیا جانے والی تحریفات اور تبدیلیاں بھی ہیں ان ہی تحریفات کے سبب سابق انبیاء کی کتابوں اور تعلیمات میں لوگوں کی ہدایت کی صلاحیت پوری طرح باقی نہیں رہی تھی۔غالباً یہی وجہ ہے کہ پے در پے پیغمبروں کو بھیجا گیا تا کہ وہ انبیاء کی فراموش کی ہوئی نعمتوں کو زندہ کریں اور ان کی تعلیمات میں جو تحریفات کی گئی ہیں ان کی اصلاح کریں۔

قطع نظر ان انبیاء کے جو صاحب کتاب وشریعت نہیں تھے بلکہ ایک صاحب کتاب وشریعت پیغمبر کے تابع تھے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک آنے والے پیغمبر اور موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک ظاہر ہونے والے پیغمبر۔خود صاحب شریعت انبیاء نے بھی اپنے سے پہلے گزرنے والے پیغمبروں کے ضابطوں اور طریقوں کی تائید کی ہے۔پیغمبروں کے پے در پے آنے کا واحد سبب حالات زندگی میں تبدیلی اور کسی نئے پیغام کی انسانی ضرورت ہی نہیں بلکہ زیادہ تر اس کا سبب وہ تحریفات

،تبدیلیاں تھیں جو آسمانی کتابوں اور انبیاء کی تعلیمات میں کی گئی تھیں۔

چند ہزار سال قبل انسان میں یہ صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ علمی اور دینی ورثوں کی حفاظت کر سکے ابھی انسان کے اندر اس صلاحیت کے پیدا ہونے کیلئے کافی وقت درکار تھا کہ وہ اپنے دینی ورثوں کو ہر طرح کے نقصان سے بچا کر محفوظ رکھ سکے اور اپنی تکمیل وترقی کے ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں پیغام الٰہی کی تجدید اور نئے پیغمبروں کی آمد کی ضرورت باقی نہ رہے اور ایک دین کی ہمیشگی کے ساتھ باقی رہنے کی لازمی شرط (کافی شرط نہیں) پوری ہو جائے۔

متذکرہ بالا آیت نزول قرآن کے بعد سے نبوت ورسالت کی تجدید کے ایک اہم سبب کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور درحقیقت ختم نبوت کی ایک بڑی بنیاد کی توثیق کرتی ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں آسمانی کتابوں میں سے اگر کوئی کتاب کسی کمی وبیشی کے بغیر پوری طرح اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے تو یہ صرف قرآن مجید ہے۔اس کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی سنتیں قطعی صورت میں بلاتردید آفات زمانہ سے آج تک محفوظ چلی آ رہی ہیں۔اہم اس بات کی بعد میں وضاحت کریں گے کہ کتاب آسمانی کو محفوظ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو ذریعہ بنایا وہ اس دور کے انسان کی رشدہ قابلیت ہے جسے انسان کے اجتماعی بلوغ کی نشانی کہا جا سکتا ہے۔

درحقیقت ختم نبوت کے ستونوں میں سے ایک بڑا ستون انسان کا اس حد تک اجتماعی بلوغ حاصل کر لینا ہے کہ وہ اپنے علمی اور دینی ورثوں کی حفاظت کر سکے ان کی نشر واشاعت تعلیم وتبلیغ اور تفسیر وتوضیح کر سکے۔اس پہلو پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

دینِ واحد

پورا قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک دین ایک ہی ہے اور تمام پیغمبروں نے انسانیت کو ایک ہی دین کی طرف دعوت دی ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیت 13 میں آیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى

ترجمہ: اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔

قرآن نے ہر جگہ اس دین کو اسلام ہی کے نام سے یاد کیا ہے جس کی طرف آدم سے لے کر خاتم تک تمام انبیاء نے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ مراد یہ نہیں ہے کہ ہر زمانے میں اس دین کا نام لفظاً اسلام ہی آیا ہے مدعا یہ ہے کہ دین جس حقیقت و ماہیت کا حامل ہے اس کا بہترین اظہار لفظ اسلام ہی سے ہوسکتا ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت 67 میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ

ترجمہ: ابراہیمؑ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

سورہ بقرہ کی آیت 132 میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے لڑکوں کے بارے میں آیا ہے:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت ابراہیم نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے بچو، اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

اس بارے میں قرآن کی آیتیں بہت زیادہ ہیں ان سے کا یہاں حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعتوں اور قوانین میں باہم کچھ اختلاف رہا ہے۔ قرآن جہاں تمام انبیاء کے دین کو ایک ہی قرار دیتا ہے وہاں بعض مسائل میں شریعتوں اور قوانین میں اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ

ترجمہ: ہم نے تو تم (انسانو) میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ (سورہ مائدہ آیت 48)

انبیاء علیہم السلام نے جن فکری اور علمی اصولوں کی طرف دعوت دی ہے وہ چونکہ بغیر کسی اختلاف کے ایک ہی ہیں اس لئے وہ شاہراہ اور ہدف بھی ایک ہے جس کی جانب انسانوں کو بلانے کیلئے انہیں مامور کیا گیا تھا۔ شریعتوں اور قوانین کے جزئی اختلاف کا اس جوہر اور ماہیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جسے قرآن کی اصطلاح میں اسلام کہا گیا ہے۔ انبیاء کی تعلیمات میں باہمی فرق و اختلاف کسی ملک کے مختلف منصوبوں اور لوائح عمل کا سا ہے۔ ہر چند کہ انہیں الگ الگ روبعمل لایا جاتا ہے لیکن

وہ سب ملک کے ایک ہی آئین سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ پیغمبروں کی تعلیمات اپنے باہمی جزی اختلافات کے بوجود ایک دوسرے کے تکمیل واتمام کا سبب بنتی ہیں۔

پیغمبروں کی آسمانی تعلیمات کا فرق واختلاف ان مکاتب خیال کے باہمی اختلافات کی طرف نہیں ہے جو فلسفہ، سیاست اجتماعیات اور اقتصادیات سے تعلق رکھتے ہیں اور متضاد افکار کے حامل ہوتے ہیں۔ تمام انبیاء ایک ہی مکتب سے تعلق رکھتے ہیں اور سب THESTSS ایک ہی رہا ہے۔

انبیاء کی تعلیمات میں باہی اختلاف کسی درس گاہ کی اعلیٰ وادنی جماعتوں کی تعلیمات کی طرح کا یا پھر ایک اصول کے مختلف حالات وشرائط میں نفاذ سے پیدا ہونے والا اختلاف کا سا۔

ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اعلیٰ جماعت کے طالب علم کو نہ صرف نئے نئے مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان پرانے مسائل کے بارے میں بھی اس کی رائے تبدیلی ہوجاتی ہے جس کا علم اس نے ابتدائی جماعت میں حاصل کیا تھا۔ انبیاء کی تعلیمات کا بھی یہی حال ہے۔

توحید وہ پہلا سنگ بنیاد ہے جسے انبیاء نصب کرنے میں مصروف رہے ہیں لیکن یہی توحید درجات ومراتب رکھتی ہے۔ عام آدمی خدائے واحد کا جو تصور رکھتا ہے وہ ایک عارف کے قلب میں پیدا ہونے والی تجلی کی طرف نہیں ہے۔ خود عارفوں کے درجات بھی مختلف ہیں:

''اگر ابوذرؓ جو کچھ سلمانؓ کے دل میں تھا اس سے واقف ہوجاتے تو ان کے بارے میں کفر کا گمان کرنے لگے اور انہیں قتل کردیتے'' [1]

[1] لوعلم ابوذر مافی قلب سلمان لقتله۔ سفینۃ البحار، مادہ ''ذر''

یہ بات واضح ہے کہ سورہ حدید کی ابتدائی آیات اور سورہ حشر کی آخر آیات اور سورہ قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ کی آیات چند ہزار سال بلکہ ایک ہزار سال پہلے کے انسان کیلئے قابل ہضم نہیں ہوسکتی تھیں، البتہ اہل توحید میں سے تھوڑے لوگ ان آیات کی گہرائی تک پہنچ سکتے تھے کتب اسلامی میں یہ بات آئی ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ علم رکھتا تھا کہ بعد کے زمانوں میں گہری فکر رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے تو اس نے قل ھواللہ احد کی آیات اور سورہ حدید کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل کیں۔'' [2]

کسی بھی بنیادی اصول کے نفاذ کی عمل صورتیں مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہیں انبیاء کے عملی رویے میں جو فرق واختلاف نظر آتا ہے اس کا تعلق قانون کے نفاذ سے ہے قانون کی روح سے نہیں، اس پہلو پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

قرآن نے دین کے کلمے کو کبھی جمع کی صورت میں استعمال نہیں کیا قرآن میں دین کا ذکر ہر جگہ واحد ومفرد شکل میں کیا گیا ہے کیونکہ آدم سے لے کر خاتم تک صرف ایک دین موجود رہا ہے کئی ادیان نہیں۔ قرآن نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ دین فطرت کا تقاضا انسان کے روحانی وجود کی آواز ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ

اے محمد اپنا رخ (اپنی فکر) دین کی سمت جمادو اس حالت میں کہ تم وحدانیت پرست ہو، جو خدا کی فطرت (آفرینش پیدائش) ہے جس پر لوگوں کو خلق کیا گیا ہے۔ (سورہ روم آیت 30)

[2] اصول کافی، ج ا ص ۹۱

انسان کی فطرت ،سرشت اورطبیعت گونا گوں ہے جب کہ دین ابتدائے آفرنیش سے قیامت تک ایک ہی ہےاوروہ انسانی فطرت وسرشت سے تعلق رکھتا ہے اس طرح انسان ی فطرت وسرشت بھی ایک سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے تھی ۔اس میں ایک بڑااراز اورعظیم فلسفہ پوشیدہ ہےاوراسی سے ہمیں ارتقاء کاایک خاص تصور ملتا ہے ارتقاء کے نظریئے سے سب واقف ہیں اس مسئلے پر ہرجگہ گفتگوہوتی رہتی ہے۔ دنیا کاارتقاءجانداروں کاارتقاءانسان اورمعاشرہ کاارتقاء۔

یہ ارتقا کی چیرہے اور یہ کس طرح صورت پذیر ہوتا ہے ؟ کیا یہ اسباب کاایک اتفاقی سلسلہ ہے جوارتقاء کی منزل تک پہنچتاہے؟ کیااس کی سرشت میں کوئی ایسی چیز ہے جوخود تکمیل تک پہنچتی ہےاوروہ اپنے اندرارتقاء کی خواہش رکھتی ہے اس لئے اس نے پہلے سے پنے لئے ارتقاء کی ایک راہ منتخب کررکھی ہے؟ کیاارتقاء کاعمل ہمیشہ ایک مقررہ متعین راہ پراور پہلے سے طے شدہ مقصدوہدف کے مطابق وقوع پذیرہوتاہے یہ عمل چندایک باراتفاقی اسباب کےتحت ایک خاص راستے پرصورت پذیر ہوتا ہے اورمسلسل اپنی سمت بدلتارہتاہے اوراپنا کوئی خاص مقصدوہدف نہیں رکھتا؟

قرآن کی روسے دنیاانسان اورمعاشرہ کاارتقاءایک ہدایت یافتہ باہدف عمل ہےاور یہ ایک ہی راہ پرصورت پذیر ہوتا ہے جسےصراط مستقیم کہا گیاہے۔اس عمل کانقطہ آغازاورراہ سفراورمنزل مقصودسب متعین ومشخص ہیں۔

انسان اورمعاشرہ تغیر پذیر ہیں لیکن ان کی سمت اورراہ سفرصرف ایک ہی ہےاوروہ مستقیم ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ

ترجمہ: نیزاس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میراسیدھاراستہ ہےلہٰذاتم اسی پرچلو اوردوسرے راستوں پرنہ چلوکہ وہ اس کے راستے سے ہٹاکرتمہیں پراگندہ کردیں گے۔(سورہ انعام۔153)

یکی خط است از اول تابہ آخر
بر اور خلق خدا جملہ مسافر

انسانی ارتقاءکامعاملہ اس طرح کانہیں ہے کہ وہ ہردورمیں اسباب کے ایک خاص سلسلے کےتحت (صنعتی یااجتماعی یااقتصادی) ایک راہ پراپناسفرشروع کرے اورمسلسل اپناراستہ اورسمت دونوں بدلتارہے۔

قرآن بڑی شدت کے ساتھ دین کے ایک ہونے پرزوردیتاہے وہ صرف ایک شاہراہ کاقائل ہے شریعتوں اورقوانین کےاختلافات کووہ ایسی شاخیں قراردیتاہے جوایک نظریئے وعقیدہ کی جڑسے نکلی ہوں۔

انسان ارتقاء کی راہ پرٹھیک اس قافلہ کی مانند ہے جوایک متعین منزل کی طرف رواں دواں ہےلیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے سے وہ آگاہ نہیں ہے چندقدم کے بعد وہ کسی واقف راہ سے منزل کا پتہ پوچھتاہے ۔اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق کم وبیش دس میل کاراستہ طے کرلیتاہےلیکن اب اس قافلے کوپھرکسی رہنما کی ضرورت پیش آتی ہے اوروہ اس کی بتائی ہوئی علامات کے مطابق مزید دس میل کاسفرمکمل کرلیتاہے ۔اس طرح منزل کی طرف بڑھنے کی اس کی صلاحیت میں بتدریج اضافہ ہوتارہتاہے بالآخراسے ایک ایساشخص مل جاتاہے جواسے راہ سفرکاایک مکمل نقشہ دے دیتاہےاورقافلہ اسے نقشہ کے حاصل ہونے کے بعدکسی نئے رہبرکی

ضرورت سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

قرآن نے یہ بات اچھی طرح واضح کردی ہے کہ انسان ایک متعین و مستقیم راہ ہے اور تمام پیغمبران تمام اختلافات کے باوجود وہ زمان ومکان اور موقع محل کے مطابق انسانی معاشروں کی رہبری میں باہم رکھتے ہیں وہ ایک ہی منزل اور ان ایک ہی شاہراہ کی جانب ان کی رہنمائی کرتے ہیں اس طرح قرآن نے ختم نبوت کی راہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے خوب روشن اور اس عقیدے کو پوری طرح واضح کردیا ہے عقیدہ ختم نبوت اسی صورت میں معقول اور قابل فہم ہوسکتا ہے کہ تغیر پذیر اور ترقی پذیر انسان کی ارتقاء کی راہ متعین اور مستقیم ہو لیکن اس کے برعکس انسان دوڑ دھوپ میں ہو اور ہر دوسرے لمحے اس کی راہ سفر تبدیل ہوتی رہے او اس کے سفر کا مقصد اور منزل متعین نہ ہو اور وقت کے ہر مرحلے میں وہ ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کرے تو پھر ختم نبوت یعنی دائمی اور کلی لائحہ عمل اور نقشہ کار معقول اور قابل فہیم نہیں قرار پاتا:

سورہ بقرہ کی آیت 143 میں اس طرح آیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اور اس طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ اور رسول تم پر گواہ ہو۔

قرآن کی رو سے امت مسلمہ ای کا امت وسط ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ امت ایسی تعلیمات کی پروردہ ہے جو توسط وتعاول کی حامل ہے قرآن کی یہ آیت ختمی امت اور ختمی تعلیمات کا ذکر صرف ایک کلمہ کے ذریعہ کردیتی ہے اور وہ وسطیت وتعاول ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام انبیاء کی تعلیمات میں وسطیت اور تعاول موجود نہیں رہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کچھ کہنا ضروری ہے

اس روئے زمین پر انسان ہی ایک جاندار مخلوق نہیں ہے اور صرف وہی اجتماعی انداز میں زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں ہے، دوسری جاندار مخلوقات بھی ہیں جو مقررہ معمولات، ایک خاص نظم اور ڈھانچے کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔ انسان کے برعکس ان کی زندگی جنگل کے زمانے پتھر کے زمانے لوہے کے زمانے ایٹم کے زمانے سے آشنا نہیں ہے۔ روز اول سے جب سے کہ وہ وجود میں آئی ہیں ان کی زندگی کا ایک ہی منظم اور ڈھانچہ ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو اس آیت قرآنی کے مطابق ہے۔

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾

ترجمہ: انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ (سورہ نساء)

اپنی زندگی کا آغاز صفر سے کرتا ہے اور ترقی کے لامتناہی راستے پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان فطرت کا ایک ہونہار اور بالغ فرزند ہے اسی لئے اسے آزادی وخودمختاری حاصل ہے اسے کسی مستقل ناظم وسرپرست اور اسی جبری ہدایت کی ضرورت نہیں جس پر عمل کرنے کیلئے کوئی پوشیدہ اندرونی قوت اسے مجبور کرے۔ دوسرے جاندار جو کچھ جبلت کے سامنے سرجھکا کر انجام دیتے ہیں وہ انسان آزادانہ ماحول میں عقل وقوانین کے مطابق انجام دیتا ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾

ترجمہ: ہم نے اسے راستہ دکھادیا خواہ شکر کرنے والا ہے یا کفر کرنے والا۔

انسان میں انحراف وسقوط اور موجد انحطاط پایا جاتا ہے جب کہ

دوسرے جاندار ایک حالت پر قائم رہتے ہیں وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ سوچ سمجھ کر خود آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں ، سیدھی جانب کا رخ کریں یا بائیں سمت کا، تیز چلیں یا آہستہ اس کے برعکس انسان اپنی عقل وشعور سے کام لے کر آگے بھی قدم بڑھا سکتا ہے پیچھے بھی ہٹ سکتا ہے وہ دائیں یا بائیں کسی بھی سمت مڑ سکتا ہے وہ تیز بھی چل سکتا ہے اور آہستہ بھی وہ ایک بندہ شاکر بھی بن سکتا ہے اور سرکش کافر بھی۔ اسطرح وہ افراط وتفریط کے درمیان کھڑا نظر آتا ہے۔

انسان معاشرہ کبھی اس طرح عادات کا سیر اور جامد وساکن ہوجاتا ہے کہ کوئی موثر طاقت ہی اس کی زنجیروں کو کاٹ کر اسے حرکت میں لاسکتی ہے، کبھی انسانی معاشرہ پر حرص وآرزو اور نئی راہوں پر چلنے کی خواہش اس طرح مسلط ہوجاتی ہے کہ وہ فطرت کے اصول وقوانین تک کو بھلا بیٹھتا ہے اور کبھی اور غرور خود پرستی اور تکبر میں غرق ہوجاتا ہے اسے خود بینی کی راہ سے ہٹا کر زہد وپرہیز گاری کی راہ پر ڈالنے کیلئے کسی اثر انداز ہونے والے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھ سکے، جب یہی انسانی معاشرہ آرام طلبی مادر پدر آزادی اور ظلم وستم کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اس میں حقوق کا شعور واحساس کے پید کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

یہ بات واضح ہے کہ تیزی کے ساتھ پیش قدمی ہو یا سست روی، بائیں جانب میلان ہو یا دائیں جانب ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک خاص لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ کا انحراف دائیں جانب ہو تو اصلاح کرنے والے طاقت کو اسے بائیں جانب موڑنے کی کوشش کرنی ہوگی دوسری صورت میں اسے اس کے برعکس عمل کرنا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک زمانے اور کسی ایک قوم کی اصلاح کیلئے کوئی تدبیر دوا کی حیثیت رکھتی ہے تو وہی تدبیر دوسرے دور اور دوسری قوم کیلئے ایک مرض

مہلک میں مبتلا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ بظاہر مختلف انبیاء کے درمیان ایک اختلاف نظر آتا ہے کسی پیامبر کو جنگ کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے تو کسی کو صلح کی کوئی نبی نرمی سے کام لیتا ہے تو کوئی سختی سے کسی پیغمبر کو انقلابی انداز میں کام کرنا پڑتا ہے تو کسی کو اعتدال وسلامتی کی راہ اپنانی پڑتی ہے ایک پیغمبر کا سارا دور ابتلا وآزمائش سے بھرا ہوا ہے تو دوسرے پیغمبر کے حصے میں فتح ونصرت بھی آتی ہے۔ انبیاء کے درمیان اختلاف کا تعلق ان کے اس رویے سے ہے جو وہ اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر اختیار کرتے ہیں ورنہ ہدف کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہدف تمام انبیاء کا ایک ہی ہے اور راستہ وہی صراط مستقیم ہے۔

قرآن کریم نے قصص انبیاء کے ضمن میں پوری طرح اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ پیغمبروں میں سے ہر ایک مبداء ومعاد سے متعلق اپنی مشترک تعلیمات کے تحت کسی ایک خاص نکتہ پر زور دیا ہے وہ ایک مخصوص لائحہ عمل کے اجراء پر مامور ہوتا ہے۔ یہ بات قصص قرآن کے مطالعہ سے بخوبی روشن ہوجاتی ہے۔

مصلحین جب کسی تیزی سے آگے قدم بڑھانے والے یا پسماندہ معاشرہ میں دائیں یا بائیں جانب مائل معاشرہ میں ظہور کرتے ہیں اور اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک متعین لائحہ عمل صرف ایک محدود مدت کیلئے قابل اجراء ہوتا ہے اور معاشرہ کسی بھی نوعیت کا ہو اسے راہ عدل پر لانے کیلئے اس سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے جتنی کہ دوسری جانب سے اسے انحطاط وانحراف کی راہ پر ڈالنے کیلئے جاتی ہے۔

ان توضیحات کے بعد ہم زیر نظر آیت کے مفہوم کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کی رسالت تمام دوسرے نبیاء کی رسالتوں سے ان معنوں میں فرق وامتیاز رکھتی ہے کہ اس کی حیثیت قانون کی ہے کسی وقتی لائحہ عمل کی

نہیں ،انسانیت کیلئے آپ کا لایا ہوا اساسی قانون کسی ترقی پسند یا رجعت پسند یا دائیں بازو یا بائیں بازوں کی جانب مائل معاشرہ کیلئے مخصوص نہیں ہے۔

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر نظام حیات ہے جو ہر موقع و محل کیلئے کارآمد اور زندگی کے تمام جزئی طریقوں پر حاوی ہے انبیاء کسی ایک معاشرہ کیلئے مبعوث کئے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاشرہ کیلئے ایک مخصوص لائحہ عمل لے کر آتے تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد علماء اور امت مسلمہ کے دینی رہنماؤں کو بھی اسی طرح کام کرنا چاہیے جس طرح انبیاء نے انجام دیا تھا۔لیکن علماء مصلحین اور انبیاء کے کام کے درمیان فرق یہ ہے کہ علماء وحی اسلام کے ابدی سرچشمے سے ہدایت حاصل کر کے ایک خاص لائحہ عمل وضع کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن دوسری آسمانی کتابوں کی وقتی کا محافظ و نگہبان قرار دیتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ

ترجمہ: پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔(سورہ مائدہ آیت۔48)

اسلامی نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام انبیاء جو ایک کلی و خاتمی نبوت اور ایک اساسی قانونی کے پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے پابندر ہے ہیں کہ وہ اپنی اپنی امتوں کو ختم نبوت کے آخری دور میں دین کے اتمام و تکمیل کی خوشخبری دیں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تمام پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا ہے۔

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں اس ذکر بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے:

ولم يخل سبحانه خلقه من نبی مرسل او كتاب منزل او حجته الازمة او محجة قائمة، رسل لاتقصر بهم قلة عددهم ولا كثة المكذبين لهم من سابق سعی له من بعده اوغاعرفه من قبله علی ذلك نسلت القرٰان ومضت للهور وسلفت الاباء خلقت الابناء الی ان بعث الله محمداً رسول الله عليه وآله لانجان عدته وتما ته ماخوذعلی النبين ميثاقه مشور سماته كريما ميلاده

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو کبھی کسی پیغمبر یا کسی کتاب آسمانی یا کافی دلیل یا کسی روشنی طریقے سے خالی نہیں رکھا ہے۔پیغمبروں کو ان کی قلب تعداد اور ان کے مخالفین کی کثرت تعداد نے کبھی ادائے فرض سے نہیں روکا۔ ہر پیغمبر اپنے سے پہلے گزرنے والے پیغمبر سے پوری طرح متعارف رہا ہے اور خود اس کی آمد کی بشارت سابق پیغمبر کی زبان لوگوں کو ملتی رہی ہے۔ اسی طرح ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی رہی اور زمانہ گزرتا چلا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلسلہ نبوت کی تکمیل کیلئے بھیجا۔ اللہ نے تمام انبیاء سے آپ کے بارے میں پہلے ہی عہد و پیمان لے رکھا تھا آپ کی نشانیاں مشہور و معروف ہو چکی تھیں۔اور آپ کی ولادت ایک ولادت عظیم تھی۔

اس بارے میں رسول اکرمؐ کے دو بڑے عمدہ کلمے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

نحن الاخرون السابقون یوم القیامة

ہم تمام پیغمبروں اور امتوں کے بعد دنیا میں آئے ہیں لیکن آخرت میں ہم سے آگے ہوں گے اور سب ہماری پیچھے آئیں گے۔

آپ کا ایک دوسرا ارشاد یہ ہے:

آدم ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ

قیامت کے دن تمام پیغمبر میرے پرچم تلے ہوں گے۔

قیامت کے دن اس پیشروی اور پس روی اور رسول اکرمؐ کے پرچم تلے تمام انبیاء کے ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ تمام انبیاء رسول اکرمؐ کی بعثت کیلئے مقدمہ ہیں تو آپ نتیجہ، سابق انبیاء پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایک وقتی لائحہ عمل کے دائرہ تک محدود تھی اور رسول اکرمؐ پر نازل ہونے والی وحی ایک کلی وابدی قانون اساسی کیلئے تھی۔ مسلمان بزرگوں نے رسول اکرمؐ کے ان دو عمدہ کلمات اور معارف اسلامی کے اس اصول سے ہدایت حاصل کرتے ہوئے کہ جو کچھ اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے س دنیا کے واقعات کا ملکوتی ظہور ہے بڑی عمدہ اور دل پذیر باتیں کہی ہیں:

وانی وان کنت ابن آدم صورة
فلی فیه معنی شاهد بابوتی
وقبل فعالی دوتکلیف ظاهری
ختمت بشرعی الموضحی کل شرعة

مولوی نے بھی یہی مضمون باندھا ہے:

ظاہراً آن شاخ اصل میوہ است
باطناً بھر ثمر شد شاخ
گر نیودی میل و امید ثمر

کی نشاندہ باغبان بیخ شجر
پس بمعنی آن شجراز میوہ زاد
گر بصورت از شجر بودش نہار
مصطفیٰ زین گفت کارم وانبیاء
خلف من باشند در زیر لوا
بھر این فرمودہ است آن زد فنون
رمز نحن الآخرون السابقون
گر بصورت من ز آدم زادہ ام
من بمعنی جد جد افتادہ ام
پس زمن زائدہ در معنی پدر
پس ز میوہ زاد در معنی شجر
اول فکر، آخر آمد در عمل
خاصہ فکری کو بود وصف اول

شبستری کہتا ہے:

یکی خط است از اول تا بہ آخر
بر او خلق خدا جملہ مسافر
در این ری انبیاء چون سار بانند
دلیل و رہنمائی کاروانند
وزیشان سید ماگشتہ سالار
ہم او اول ہم او آخر در این کار
احد درمیم احمد گشت ظاہر

در این دور اول آمد عین آخر
ز احمد تا احد یک میم فرق است
جھانی اندرین یک میم غرق است
براو ختم آمد پایان این راہ
بدومنزل شدہ ادعوا الی اللہ
مقام دلکشایش جمع جمع است
جمال جانفرایش شمع جم است
شدہ اوپیش و دلھا جملہ در پی
گرفتہ دست جا دھا دامن وی

قرآن کریم نے بعد میں آنے انبیاء (اور بدرجۂ اولیٰ خاتم انبیاء) پرسابق انبیاء کی جانب سے ایمان لانے ان کی نبوت کوتسلیم کرنے بلکہ ان کی آمد پرخوشخبری دینے کااوران کی اس ذمہ داری کا کہ وہ اپنی امت کوبھی ایسا کرنے کی ہدایت کریں اورانہیں بعد میں آنے والے انبیاء کی تعلیمات کوقبول کرنے کیلئے تیارکریں اوراسی طرح بعد میں آنے والے پیغمبروں کی جانب سے پیشرو پیغمبروں کی تائیدوتصدیق کااوراللہ تعالیٰ کااپنے پیغمبروں سے اس خوشخبری اس تسلیم تائیداور تصدیق پر پختہ عہد لینے کااس طرح ذکرکیاہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

ترجمہ: یادکروں اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ’’آج میں نے تمہیں کتاب اورحکمت ودانش سے نوازا ہے۔کل اگرکوئی دوسرارسول تمہارے پاس موجود ہےتوتم کواس پرایمان لانا ہوگااوراس کی مددکرنی ہوگی‘‘ یہ ارشادفرماکراللہ نے پوچھا کیاتم اس کااقرارکرتے ہواوراس پرمیری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔انہوں نے کہا، ہاں ہم اقرارکرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا اچھاتوگواررہواورمیں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔(سورہ آل عمران۔81)

نبوتوں کاایک رشتہ میں بندھاہونااورایک نبوت کادوسری سے مربوط ہوتے چلے جانایہ ظاہرکرتے ہیں کہ نبوت تکمیل کی جانب ایک تدریجی سفر ہےجس کاآخری حلقہ اس کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔عارفین اسلام کہتے ہیں۔

الخاتم من ختم المراتب باسرھا

یعنی پیغمبرخاتم وہ ہےجس نے تمام مراحل طے کرلئے اوروحی کی روسے کوئی ایسی راہ باقی نہیں رہ گئی ہے جسے اس نے طے نہ کیا ہواورکوئی ایسانکتہ باقی نہیں رہ گیا ہےجس کی اس نے وضاحت نہ کی ہو۔اگرہم یہ فرض کرلیں کہ کسی علم سے متعلق تمام مسائل حل ہوچکے ہیں توپھراس شعبہ میں کسی نئی تحقیق یاکسی نئے انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔وحی سے متعلق مسائل کامعاملہ بھی بالکل ایساہی ہے ۔خداکے آخری دستور کے آجانے کے بعدکسی نئے انکشاف اورکسی نئے پیغمبرکی ضرورت باقی نہیں رہتی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جوکچھ انسان پرمنکشف ہواہےاسے ایک ایسے کامل ترین مکاشفہ کی حیثیت حاصل ہے جوکسی انسان کے دائرہ امکان میں ہوسکتا ہے۔یہ بات واضح ہے کہ ایک ایسے مکمل مکاشفہ کے بعددوسراجوبھی مکاشفہ ہوگاوہ کوئی نیااورجدید مکاشفہ ہوگاوہ دراصل پہلے سے طے کردہ راہ کی ہی ایک چیز ہوگی اس کے ساتھ کوئی نئی

بات نہ ہوگی، آخری بات تو وہی ہے جو اس کامل ترین مکاشفہ میں آچکی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١١٥﴾

ترجمہ: تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔(سورہ انعام۔115)

انسانی فطرت کا ہدف ومقصود قرب الٰہی کے مقام تک پہنچتا ہے اور پیغمبروں کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس اعتبار سے نبوت نظام زندگی کا ایک حصہ قرار پاتی ہے لیکن اس کا مقصود اور ہدف سب سے اونچا مرتبہ اور نبوت کا آخری درجہ ہے نہ کہ نبوت کا اولین درجہ۔ سنت الٰہی کے مطابق نبوت بتدریج درجہ کمال تک پہنچتی ہے جیسے کہ ایک عمارت بتدریج مکمل ہوتی ہے۔ عمارت کی تعمیر کا ہدف اس کے پایے اور دیواریں نہیں ایک مکمل مکان ہوتا ہے۔ نبوت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے نبوت کا ہدف اس کی کامل صورت ہے یہی وجہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ایک جگہ پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے اور مکمل ہوجاتا ہے۔ وہ مزید کسی اضافے کو قبول نہیں کرتا کیونکہ تکمیل کے بعد کوئی اضافہ کمال کے منافی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ایک زائد انگلی کی سی ہوجاتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی معروف حدیث میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا نبوت ایک مکان کی مانند ہے جو تیار ہوچکا ہے لیکن اس کے مکمل ہونے میں صرف ایک اینٹ کی جگہ باقی رہ گئی ہے اس جگہ کو میں ہی پھرنے والا ہوں یا میں

ہی اس آخری اینٹ کا نصب کرنے والا ہوں۔[1]

ہم نے گزشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا ہے وہ عقیدہ ختم نبوت کے پس منظر اور اس کی بنیادوں کی جانب رہنمائی کیلئے کافی ہے۔

یہ بات واضح ہوگی کہ انسانی فطرت میں دین کی طلب وہ بنیاد ہے جس پر عقیدہ ختم نبوت استوار ہوتا ہے تمام انسانوں کی فطرت ایک ہے تکمیل انسانیات کا سفر ایک ایسا بامقصد سفر ہے جو ایک متعین اور سیدھے راستہ پر جاری ہے اس اعتبار سے دین حق، جو فطرت کے تقاضوں کی وضاحت کرتا ہے اور انسان کی راہ براہ راست کی جانب رہنمائی کرتا ہے صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔

ایک طریق زندگی جو انسانی فطرت کے مطابق ہو، جامع اور کلی ہو اور ہر طرح کی تبدیلی وتحریف سے محفوظ ہو اور جو مسائل کی اچھی طرح تشخیص کرسکے اور جسے اچھی طرح منطبق کیا جاسکے اور عمل ونفاذ کے مرحلے میں ہمیشہ رہنمائی کرسکے اور حالات کے مطابق مختلف طریقوں لائحہ عمل اور بے شمار جزئی قوانین کیلئے سرچشمہ ثابت ہوسکے انسانی فطرت کا ایک اہم تقاضا اور انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے آئندہ مضامین اس پہلو کو بہتر طریقے پر واضح کریں گے۔

اب ہم ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں جن کی طرف ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔

[1] مجمع البیان میں اس حدیث کا متن سورہ احزاب کی آیت 40 کے ذیل میں صحیح بخاری اور مسلم کے حوالے سے اس طرح درج کیا گیا ہے: انما مثلی فی الانبیاء کمثل رجل نبی دارأفا کملها وحسنها الا موضع لبنة مکان من دخل فیها فنظر الیها قال ما احسنها الا موضع هذه اللبنة فانا موضع هذه ختم بی الانبیاء

آسمانی دروازے

پہلاسوال جس کے سبب ختم نبوت کاعقیدہ وجود میں آیا وہ عالم غیب اورانسان کے درمیان رابطے سے تعلق رکھتاہے۔وہ سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے دور کے انسان نے اپنی جہالت اور بے علمی کے باجود وحی والہام کے راستے سے عالم غیب کے ساتھ کس طرح رابطہ پیدا کرلیااوراس پرآسمان کے دروازے کیسے کھل گئے جب کہ ترقی یافتہ بعد کاانسان اس سے محروم رہااوراس پرآسمان کے دروازے بند ہوگئے۔

کیافی الواقع انسان کی روحانی اور باطنی صلاحیتیں کم ہوگی ہیں اوروہ اس اعتبار سے تنزل میں چلا گیا ہے۔

یہ شبہ اس خیال سے پیدا ہواہے کہ عالم غیب کے ساتھ معنوی رابط وتعلق انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے سلسلہ نبوت کے منقطع ہونے کالازمی نتیجہ عالم غیب اورعالم انسان کے درمیان روحانی اورمعنوی رابطے کے انقطاع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

لیکن یہ خیال اپنی کوئی بنیادنہیں رکھتا قرآن کریم بھی غیب اورملکوت کے ساتھ اتصال کے درمیان اورمقام نبوت کے درمیان لازم وملزوم کے تعلق کا قائل نہیں ہے جیسا کہ خرق عادت کووہ پیغمبری کی واحد دلیل تسلیم نہیں کرتا۔قرآن کریم ایسے اشخاص کابھی ذکرکرتا ہے کہ ان کی معنوی زندگی ایسی طاقت سے بہرہ مندرہی ہے کہ انہوں نے فرشتوں کے ساتھ ہم کلامی کی ہے اوران سے خارق العادت (غیرمعمولی) امورانجام پائے ہیں حالانکہ وہ اشخاص نبی نہیں تھے،اس کی بہترمثال عمران کی بیٹی

عیسیٰؑ مسیح کی ماں مریمؑ ہے۔قرآن نے ان کے بارے میں حیرت انگیز واقعات کا ذکر کیا ہے قرآن موسیٰؑ کی والدہ کے بارے میں بھی کہتا ہے ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ موسیٰؑ کو دودھ پلائے اورجب اسے موسیٰؑ کے بارے میں کسی خوف کااحساس ہوتو اسے دریا میں بہادے ہم اسے محفوظ رکھ کر تیری طرف واپس لوٹادیں گے۔ہمیں معلوم ہے کہ عیسیٰؑ کی ماں پیغمبرتھیں اورنہ موسیٰؑ کی والدہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ملکوتی حقائق کے غیب وشہود کے ساتھ اتصال آوازغیبی کا سننااور بالآخر غیب سے خبرکا پانا نبوت نہیں ہے،نبوت پیغام کالانا ہے ہروہ شخص جسے غیب کی خبرمل جائے،پیغام کالانے والےنہیں ہوتا۔

قرآن اشراق اورالہام کادروازہ ان تمام لوگوں پرکھولتا ہے جواپنے باطن کوپاک کرلیتے ہیں:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

اگرتم خداترسی اختیارکروگے تم اللہ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچادے گا۔(سورہ انفال۔29)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ

جولوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔(سورہ عنکبوت۔69)

اسی فلسفہ کے نقطہ نظر سے معنوی اورعرفانی زندگی کاایک نمونہ پیش کرنے کیلئے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا کافی ہوگا۔

نہج البلاغہ کے خطبہ 220 میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے:

ان اللہ تعالیٰ جعل الذکر جلاءللقرب تسمع به بعد

الوقوة وتبصر به بعد العشوة وتنقاد به بعد المعاندة ومابرح لله عزت آلائه فی البرهه بعد البرهة وفی ازمان الفترات اعبادناجاهم فی فکرهم وکلهم فی ذات عقولهم

اللہ تعالیٰ نے اپنی یادکودلوں کا صیقل قرار دیا ہے۔ دل بہرے ہوجانے کے بعد بھی اس ذکر کے ذریعہ سننے والے اور اندھے ہوجائے کے بعد دیکھنے والے اور سرکشی وعناد کی راہ پرچل پڑے کے بعد بھی مطیع وفرمانبردار ہوجاتے ہیں، ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اورآج بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ زمانے کے ہر ایک حصے میں اوران میں جب کہ لوگوں کے درمیان کوئی پیغمبر موجود نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جن کے دلوں میں وہ کوئی راز کی بات ڈالتا رہا ہے اوران کی عقلوں کی راہ سے ان کے ساتھ بات کرتا رہا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

ان للہ عبادلیسوا بأنبیاء لیغبطہم النبوۃ

اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی موجود ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن نبوت ان پر رشک کرتی ہے۔

شیعہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی باطنی ولایت وامامت کے قائل ہیں جب کہ وہ انہیں نبی نہیں سمجھتے اس سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

عارفین اسلام نے عرفانی اصطلاحات میں معنی سیر وسلوک کے مراتب کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے ہم طول کلام سے بچنے کیلئے اس کے صرف دو مرحلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(ا) سفراز خلق بہ حق (مخلوق کی طرف سے خالق کی جانب سفر)

(ب) سفراز حق بہ خلق (خالق کی طرف سے مخلوق کی جانب سفر)

مخلوق کی جانب سے خالق کی طرف سفر پیغمبروں کیلئے مخصوص نہیں ہے پیغمبر تو معبوث ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ اس سفر میں انسان کی مدد کریں، جو کچھ پیغمبروں کیلئے مخصوص ہے وہ خالق کی جانب سے مخلوق کی جانب سفر ہے یعنی وہ مخلوق کی دستگیری اور ارشاد وہدایت پر مامور ہیں اس سے مراد پیغمبر کی کثرت کی جانب واپسی ہے تا کہ اسے وحدت کی راہ دکھا سکے۔

صدر المتالھین مفاتیح الغیب کے صفحہ 13 پر لکھتے ہیں!

''وحی یعنی پیغمبری اور منصب نبوت کیلئے قلب وسماعت پر فرشتے کا نزول منقطع ہو چکا ہے اور اب کسی شخص پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوگا اور اسے کسی فرمان الٰہی کے جاری کرنے پر مامور نہیں کیا جائے گا کیونکہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے حکم کے تحت جو کچھ وحی کے راستے انسان تک پہنچتا تھا وہ پہنچ چکا ہے لیکن الہام واشراق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا، اس راہ کا مسدود ہونا ممکن نہیں۔ [1]

اس سلسلے میں پہلی بہت کچھ کہا جا چکا ہے اس کا نقل کرنا موجب طوالت ہوگا۔ ہمارے زمانے کے دانشمندوں میں سے علامہ اقبال نے ایک بڑی لطیف کی بات کہی ہے۔ اقبال نے نبی اور عارف کے درمیان (ان کے قول کے مطابق مرد

[1] صدر المتالین۔ مفاتیح الغیب میں اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس حدیث کو ہمارے مسلک سے اور دوسرے مسلکوں سے بھی تعلق رکھنے والے اہل حدیث نے نقل کیا ہے یعنی معتبر شیعہ وسنی محدثین نے روایت کیا ہے اس کیلئے کتاب ''الشواہد الربوبیہ'' کی آخری فصل سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

باطنی) فرق کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ایک مرد عارف تجربہ اتحادی (وصول بہ حق) سے حاصل ہونے والے اطمینان وسکون کے بعد حیات دنیوی کی جانب واپسی کو پسند نہیں کرتا۔ اگر وہ ضرورت کی بنا پر واپس بھی آتا ہے تو انسانیت کیلئے اس کی واپسی چنداں سود مند نہیں ہوتی لیکن خلق کی طرف پیغمبر کی واپسی ثمر بخش اور تخلیق پہلو کی حامل ہوتی ہے۔ پیغمبر واپس آتا ہے اور وقت کے دھارے میں اتر جاتا ہے تا کہ تاریخ کے دھارے کو قابو میں لائے اور اس طرح کمال مقاصد سے ایک جان تازہ پیدا کرے، ایک مرد عارف کیلئے تجربہ اتحادی (وصول بہ حق) سے حاصل ہونے والا سکون ایک انتہائی مرحلہ ہے اور پیغمبر کیلئے اس کی روحانی قوت کا بیدار ہونا ہے جو ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، یہ قوت ایک ایسے اندازے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے کہ عالم انسانی میں ایک مکمل انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ پیغمبری کو ایک ایسی باطنی خود آگاہی رکھنے والی نوع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تجربہ اتحادی (وصول بہ حق) اپنی حدود سے باہر نکلنے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور ایسے مواقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی طاقتوں کی از سر نو توجیہ کرے یا انہیں ایک تازہ شکل دے۔[1]

پس انقطاع نبوت سے مراد ارشاد ہدایت کیلئے خدا کی طرف سے ماموریت کا منقطع ہونا ہے خدا کی طرف سفر کرنے والوں اور سالکوں کیلئے معنوی فیض کا منقطع ہونا نہیں۔

اگر ہم نے یہ گمان کیا کہ اسلام نے ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ معنوی زندگی کی بھی نفی کر دی ہے تو ہم سخت غلطی کریں گے۔

[1] ''اسلام میں احیاء فکر دینی ترجمہ احمد آرام، ص123۔124

نبوت تبلیغی

دوسرا سوال یہ ہے کہ پیغمبران کرام بحیثیت مجموعی دو بڑی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔ وہ خدا کی طرف سے انسان کیلئے قانون اور دستور العمل لاتے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کے ساتھ انہیں اس دور اور زمانے کے الٰہی دستور العمل پر کاربند ہونے کی دعوت دیتے رہے ہیں پیغمبروں کی اکثریت اسی دوسرے فریضے کے نجام دینے پر مامور رہی ہے۔ ایسے پیغمبروں کی تعداد بہت کم ہے جن کو قرآن اولوالعزم قرار دیتا ہے اور جن کے ذریعے قانون اور دستور العمل بھیجا گیا ہے۔ اس اعتبار سے نبوتیں دو قسم کی رہی ہیں ایک نبوت تشریعی اور دوسری نبوت تبلیغی ....تشریعی پیغمبر جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ وہ صاحب شریعت وقانون انبیاء کہلاتے ہیں جب کہ تبلیغی پیغمبروں کا کام صاحب شریعت پیغمبروں کی تعلیمات کو عام کرنا اوران ہی کے مطابق تعلیم وارشاد کا کام انجام دینا رہا ہے، اسلام نے ختم نبوت کا اعلان کر کے نہ صرف تشریعی نبوت بلکہ تبلیغی نبوت کے سلسلے کو بھی ختم کر دیا ہے۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ امت محمد اور ملت اسلامیہ کو پیغمبروں کے ہدایت وارشاد کے اس سلسلے سے کیوں محروم کیا گیا؟

بالفرض ہم نے یہ بات تسلیم کر لی کہ تکمیل اتمام اور جامعیت وکلیت کی بنا پر تشریعی نبوت کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا لیکن تبلیغی نبوت کے سلسلے کو کس حکمت وفلسفے کی بناء پر ختم کیا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت وحی کی اصل ذمہ داری یعنی وہی پہلی ذمہ داری (تشریعی) ہے جب کہ تبلیغی تعلیم اور دعوت کی ذمہ داری (تبلیغی) نصف بشری

ہے تو نصف الٰہی۔

وحی اور نبوت یعنی عالم وجود کی بنیادوں سے ایک پوشیدہ اتصال اور رابطہ اور مخلوق کی ہدایت کیلئے اس کی ماموریت دراصل مظاہر ہدایت کا ایک مظہر ہے جو سارے عالم وجود پر حکم فرما ہے۔

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بنایا۔ (سورہ طٰہٰ۔50)

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳

جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔ (سورہ اعلیٰ۔2۔3)

موجودات زندگی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس درجہ کمال کی مناسبت سے جس پر وہ پہنچ جاتے ہیں ہدایت خاص سے بہرہ مند ہوتے ہیں یعنی ہدایت کی شکل اور خصوصیت زندگی کے مختلف مراحل کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے تمام دانشور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حیوانات اپنی ساخت کے وسائل طبیعی کے اعتبار سے ضعیف تر اور ناتوان تو ہیں لیکن وہ پوشیدہ جبلی رہنمائی کے اعتبار سے قوی تر ہوتے ہیں انہیں فطرت کی ایک مستقل سرپرستی اور حمایت حاصل رہتی ہے۔ وہ جس قدر طبیعی وسائل اور عقل وہمی خیالی اور حسی طاقتوں سے لیس ہوتے چلے جاتے ہیں وہ وجود کی سیڑھی پر ان کے قدم بلندی کی جانب اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی جبلی ہدایت میں کمی آنے لگتے ہے۔ ٹھیک اس بچے کی طرف جو کمسنی کے ابتدائی مراحل میں ماں باپ اور دوسرے اشخاص کی مستقل سرپرستی اور نگرانی سے بہرہ ور رہتا ہے اور جس قدر وہ

رشد و بلوغ حاصل کرتا جاتا ہے والدین کی مستقل نگرانی و سرپرستی کے دائرے سے باہر نکلتا چلا جاتا ہے۔

جاندار مخلوقات کا زندگی کی سیڑھیوں پر چڑھ کر بلند ہونا اور ان کا عقلی، وہمی، خیالی، حسی اور عضوی وسائل سے لیس ہونا ان کے استحکام واستقلال کو بڑھانا ہے اور اس اعتبار سے ان کی جبلی ہدایت کم ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیڑے سے دوسرے تمام حیوانات کی بہ نسبت جبلی ہدایت سے زیادہ لیس ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تکمیلی مراحل کے اعتبار سے سب سے نچلے درجہ میں ہیں اور انسان جو تکمیل کی سیڑھی کے سب سے اونچے مقام پر پہنچا ہوا ہے تمام مخلوقات کی بہ نسبت جبلی ہدایت میں کمزورتر ہے۔

وحی ہدایت کے عالی ترین مراتب ومظاہر میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی رہنمائی رکھتی ہے جو حس خیال عقل علم اور فلسفہ کی دسترس سے باہر ہے ان میں سے کوئی چیز وحی کی جگہ نہیں لے سکتی وحی تشریعی ہی اس خصوصیت کی حامل ہے وحی تبلیغی نہیں وحی تبلیغی کا معاملہ دوسرا ہے۔

انسان اس وقت تک تبلیغی وحی کا محتاج رہتا ہے جب تک اس کی عقل علم اور تمدن کا درجہ اس مقام تک بلند نہیں ہوجاتا کہ وہ خود اپنے دین کے بارے میں دعوت، تعلیم، تبلیغ تفسیر اور اجتہاد کا فرض انجام دے سکے۔ علم اور عقل کا ظہور دوسرے الفاظ میں انسانیت کا رشد و بلوغ خود وحی تبلیغی کو ختم کر دیتا ہے اور علماء ان انبیاء کے جانشین قرار پاتے ہیں۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے قرآن نے اپنی نازل ہونے والی پہلی آیت میں پڑھنے لکھنے کی اور قلم وعلم کی بات کی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ

وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾

پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (سورہ علق۔1 تا5)

یہ آیت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ قرآن کا عہد پڑھنے لکھنے سکھانے کا اور علم وعقل کا عہد ہے۔ یہ آیت ہمیں اشارتاً بتاتی ہے کہ قرآن کے اس دور میں تعلیم تبلیغ اور آسمانی آیات کی حفاظت کی ذمہ داری علماء کی طرف منتقل کردی گئی ہے اور علماء اس اعتبار سے انبیاء کے جانشین قرار پاتے ہیں۔ اس آیت نے اس عہد میں بشریت کے استقلال اور بلوغ کا اعلان کیا ہے۔ قرآن نے اپنی تمام آیات میں تدبر عقلی استدلال فطرت کے تجرباتی وعینی مشاہدہ تاریخ کے مطالعہ اور گہرے غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ سب ختم نبوت کی اور وحی تبلیغی کی جگہ علم وعقل کے جانشین ہونے کی نشانیاں ہیں۔

قرآن کیلئے جس قدر کام ہو چکا ہے کیا کسی دوسری آسمانی کتاب کیلئے اس قدر کام انجام دیا گیا ہے؟ نزول قرآن کے ساتھ ہی قرآن کے ہزاروں حفاظ پیدا ہو گئے۔ نزول قرآن کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ علوم قرآنی کی خاطر نحو وصرف قواعد زبان اور عربی زبان کی لغات کی تیاری کا کام شروع ہو چکا تھا۔ معانی بیان اور بدایع کا علم ایجاد ہوا، ہزاروں تفسیریں اور ان کے مفسرین، تفسیر قرآن کی درگاہیں وجود میں آ گئیں قرآن کے لفظ لفظ کے بارے میں تحقیق کا کام ہونے لگا اس کام کا زیادہ حصہ ان لوگوں کے ہاتھ انجام پاتا رہا جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔

صرف یہ قرآن سے متعلق خاطر ہی ہے جس نے اس قدر جوش وجذبہ پیدا کر دیا۔ یہ ساری سرگرمیاں آخر توریت، انجیل اور اوستا کیلئے کیوں ظاہر نہیں ہوئیں؟ کیا خود یہ بات بشریت کے رشد وبلوغ اور کتاب آسمانی کی تبلیغ وتعلیم وحفاظت اس کی صلاحیت پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ عقل ودانش نبوت تبلیغی کی جانشین بن گئی ہے۔

انسان اپنے ابتدائی دور میں مکتب کے اس کمسن بچے کی طرح تھا جو چند روز بعد ہی اپنی کتاب کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اس کے برعکس عہد اسلامی کا انسان ایک بزرگ عالم کی طرح ہے کہ وہ جس قدر اپنی کتابوں کا بار بار مطالعہ کرتا ہے اسی قدر ان کے مضامین اسے یاد ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ ان کی گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کو بالعموم عہد تاریخ اور تاریخ سے پہلے کے عہد کے دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا عہد اس دور کو کہا جاتا ہے جس میں انسان اپنی یادداشتوں کو کتبوں اور کتابوں کی صورت میں محفوظ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس دور کی زندگی کے بارے میں ان یادداشتوں کو فیصلہ کن قرار دیا جاتا ہے لیکن ماقبل تاریخ کے عہد کے ایسے کوئی آثار موجود نہیں ہیں جو اس زمانے کی زندگی کے بارے میں فیصلہ کی بنیاد بن سکیں۔

لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عہد تاریخ کے آثار بھی زیادہ تر پراگندہ اور منتشر ہیں البتہ اس عہد کا وہ آخری ظہور اسلام کے دور سے پوری طرح متصل ہے جس میں انسان نے اپنی تاریخ اور آثار کو منظم طریقے پر نسل بہ نسل منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ خود اسلام کو اس رشد عقل کا ایک بڑا عامل سمجھا جاتا ہے۔ عہد اسلامی میں مسلمانوں نے خود اپنے آثار کی حفاظت ونگہداشت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں نے پچھلی قوموں کے آثار کی بھی کم وبیش حفاظت کی اور انہیں بعد کی

نسلوں کی طرف منتقل کرتے رہے۔ یہ ختم نبوت کا قریبی زمانہ ہی ہے کہ جس میں انسان نے اپنے علمی اور دینی ورثوں کی حفاظت کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ امر واقع یہ ہے کہ حقیقی عہد تاریخ ظہور اسلام کے عہد سے بالکل متصل ہے۔ گزشتہ ادوار میں ایک طرف نفیس علمی، فلسفی اور دینی آثار کا ظہور ہوا اور دوسرے طرف یہ آثار آب و آتش کی نذر بھی ہوتے رہے۔ تاریخ میں اس کی دردناک تفصیلات پوری طرح محفوظ ہیں۔

اسکندریہ کا عظیم علمی مرکز مشرقی روم کی شہنشاہیت پر مسیحت کے اثر و رسوخ کے بعد تباہ ہوگیا اور اس مرکز کا تاریخ کتب خانہ متعصب عیسائیوں کے ہاتھوں نذر آتش ہوگیا۔[1]

علم کے ظہور اور ترقی کے ایک ایسے درجے تک انسان کی رسائی کہ وہ دین آسمانی کا محافظ داعی اور مبلغ بن سکے، نبوت تبلیغی کی ضرورت باقی رہنے نہ دی اور اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ یہی وجہ ہے پیغمبر اکرمؐ نے اس امت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کی مانند کہا ہے۔

علامہ اقبال نے ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے:

---

[1] کافی عرصہ پہلے یہ بات شائع کی گئی تھی کہ اس کتب خانے کو مسلمانوں نے مصر کی فتح کے موقعہ پر نذر آتش کیا تھا۔ یہ بے بنیاد بات اس قدر پھیلائی گئی کہ بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے خود اپنی کتابوں میں اسے نقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ کسی معتبر کتاب میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے، حال ہی میں محققین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ کتب خانہ متعصب عیسائیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا تھا اور اس واقعہ کو مسلمانوں سے منسوب کرنے والا بھی ایک عیسائی ہے کہ جو اس واقعہ کے دو سو سال بعد گزرا ہے۔ ویل دورانت کی کتاب ''تاریخ تمدن'' کے ترجمہ کی گیارہ جلد کے صفحہ 219 پر دیکھیں اور شبلی نعمانی کے رسالہ کتانجانہ اسکندریہ سے جو اسی موضوع پر لکھا گیا ہے رجوع کریں۔

''پیغمبر اسلام دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان کھڑے ہیں الہام کے سرچشمے سے جب آپ کا رشتہ جوڑا جاتا ہے تو دنیائے قدیم سے آپ کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور جب روح الہام کو بروئے کار لایا جاتا ہے تو دنیائے جدید سے آپ کا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ زندگی نے آپ کی ذات میں معرفت کے وہ دوسرے سرچشمے دریافت کر لئے ہیں جو اس (زندگی) کے نئے سفر کیلئے موزوں ہیں۔ اسلام کا ظہور دراصل استدلالی اور استقرائی عقل کا وجود میں آنا ہے۔ ظہور اسلام کے ساتھ رسالت، خود نبوت کے اختتام پذیر ہونے کی ضرورت کے نتیجے میں، حد کمال کو پہنچ جاتی ہے جس سے لازماً یہ دانش مندانہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی ہمیشہ کمسنی کے مرحلے میں اور باہر سے رہنمائی کی محتاج نہیں رہ سکتی۔ اسلام میں کاہنی (فالگیری) اور موروثی سلطنت کی نفی اور قرآن میں عقل اور تجربہ پردائمی توجہ اور اس کتاب مبین کا فطرت اور تاریخ کو معرفت بشری کے سرچشموں کی حیثیت دینا دراصل ختم نبوت کے واحد عقیدے کے مختلف خدوخال ہی۔ عقیدہ ختم نبوت کے یہ معنے نہیں لینے چاہئیں کہ زندگی کی انتہائی سرنوشت یہ ہے کہ عقل کامل جذبات و احساسات کی جگہ حاصل کر لے۔ یہ بات یہ ممکن ہے اور نہ مطلوب''[2]

اسلام نے اعلان ختم نبوت کے ضمن میں اپنی ابدیت کا اعلان کیا ہے:

حلال محمد حلال الی یوم القیامة وحرام محمد حرام الی یوم القیامة

ترجمہ: محمدؐ کا حلال کیا ہوا قیامت تک حلال ہے اور محمدؐ کا حرام کیا ہوا قیامت

---

[2] اسلام میں دینی فکر کا احیاء ص145

تک حرام ہے۔[1]

سوالات اوراعتراضات کی ساری بوچھاڑ کاتعلق اسی موضوع سے ہے کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کی لئے ہمیشگی ممکن ہے؟

دنیامیں ہر چیز فانی ہےاس دنیا کی اصل بنیادتغیر ہے، دنیامیں صرف ایک ہی چیز جادوانی ہےاوروہ یہ ہے کہ کسی چیز کوہمیشگی حاصل نہیں۔

ہمیشگی اورابدیت کے منکر کبھی اپنی باتوں کوفلسفہ کارنگ دے دیتے ہیں اور دلیل میں تغیروتبدل کےاس قانون کوپیش کرتے ہیں جوفطرت کاایک مجموعی قانون ہے۔

اگرہم مسئلے پراس نقطہ نظر سے غورکریں تواعتراض کاواضح جواب مل جاتا ہے کہ وہ چیز جو ہمیشہ تغیر وتبدل سے دوچاررہتی ہے وہ مادہ اوردنیا کی مادی ترکیبات ہیں لیکن قوانین اورانتظامات خواہ وہ طبیعی نظامات ہوں یاوہ اجتماعی نظامات جوطبیعی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں اس قانون تغیروتبدل کےتحت نہیں آتے۔ستارے اورشمسی نظامات ظاہر ہوتے ہیں اور چند دنوں بعد فرسودہ اورفانی ہوجاتے ہیں لیکن قانون کشش اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔نباتات اورحیوانات وجود میں آتے ہیں اورفنا ہوجاتے ہیں لیکن قوانین حیات باقی رہتے ہیں۔

یہی حال انسانوں اوران کی زندگی کے قانون کا ہے۔انسان جن میں پیغمبر بھی شامل ہیں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں لیکن پیغمبر کالایاہوا آسمانی قانون زندہ اور تابندرہتا ہے۔

مصطفیٰ راوعدہ دادالطاف حق
گربمیری تو نمیرد این سبق

[1] اصول کافی ج2،ص17

مظاہرفطرت تغیر پذیر ہیں قوانین فطرت کوتغیرنہیں، اسلام قانون ہے نہ کہ مظاہرکائنات میں سے ایک مظہر، اسلام اسی صورت میں مردہ ہوسکتا ہے کہ وہ قوانین فطرت سے ہم آہنگ نہ ہولیکن جب اسلام کااپنادعویٰ ہے کہ وہ فطرت اورانسانی سرشت سے اوراس کے معاشرے سے تازگی اورقوت حاصل کرتا ہے اورقوانین فطرت سےہم آہنگ ہےتوآخروہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

کبھی اجتماعیت کے پہلو سے اعتراض کیاجاتا ہے اورکہاجاتا ہے کہ اجتماعی ضوابط اجتماعی تقاضوں کی بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں جب معاشرہ کی ضروریات قوانین اجتماعی کی بنیاد ہیں توان کا عوامل تمدن کی توسیع وتکمیل کے ساتھ ساتھ متغیرہونابھی ضروری ہے۔ ہرزمانے کےضروریات دوسرے زمانے کی ضروریات سے مختلف ہوتی ہیں ،میزائیل طیاروں بجلی اورٹیلی ویژن کے اس جدید دور کی ضروریات گھوڑوں، خچروں اوراونٹوں کی پرانے زمانے کی ضروریات سے قطعی مختلف ہوں گی۔ یہ کسی طرح ممکن ہے کہ اس جدید دور کیلئے بھی وہی ضوابطہ نافذ ہوں جوپرانے زمانے میں رائج تھے۔دوسری الفاظ میں عوامل تمدن کے اندرترقی وتوسیع لازماًنئے تقاضے پیداکرے گی۔اس لئے جبرتاریخ کاراستہ روکنااورزمانے کوایک ہی حال پررکھناممکن نہیں ہےاورزمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی اختیارنہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔جامداوریکساں ضوابط کاپابندرہنامققضیات زمانہ کے ساتھ مطابقت اورلچک پیداکرنے اورتمدن کے قافلے کےساتھ ہم آہنگ ہونے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

بے شک اہم ترین مسئلہ جس سے اس دور میں مذاہب خصوصاًاسلام دوچارہے یہی مسئلہ ہے۔ہماری نئی نسل بجزتغیروتبدل اورجدت طلبی اورزمانے کے نئے نئے تقاضوں کے سوا کچھ نہیں ہوچتی۔نئی نسل کاسامناکرتے ہوئے جوبات سب سے

پہلے کانوں تک پہنچتی ہے وہ یہی ہے اس نسل کے انتہا پسندوں کے نقطہ نظر سے مذہب اور نوطلبی دو متضاد وجود ہیں نوطلبی کی خاصیت حرکت اور ماضی سے منہ موڑنا ہے جب کہ مذہب کی خاصیت جمود سکون، ماضی سے وابستگی اور موجودہ وضع کی حفاظت کرنا ہے۔

اسلام کو دوسرے ہر مذہب سے زیادہ اس طرز فکر کے حامل گروہ سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اسلام کا ابدیت وہمیشگی کا دعویٰ اس گروہ کیلئے بڑا ناقابل برداشت ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں عمل دخل رکھتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان تعلق سے لے کر افراد کے اجتماعی روابط، خاندانی روابط فرد اور اجتماعی کے روابط انسان اور اس دنیا کے باہمی روابط سب ہی سے وہ بحث کرتا ہے۔ اگر اسلام دوسرے مذاہب کی طرف چند رسوم، عبادات اور خشک اخلاقی ضوابط تک محدود ہوتا تو پھر اس کیلئے کوئی دشوری نہ تھی لیکن وہ اپنے اس قدر مدنی فوجداری، دیوانی سیاسی اجتماعی اور خاندانی قوانین وضوابط رکھتے ہوئے کیا کرسکتا ہے؟

ہم نے اوپر جو اعتراض نقل کیا ہے اس میں جبر تاریخ ضروریات میں تغیر مقتضیات زمانہ کی رعایت جیسے نکات کو اٹھایا گیا ہے اس لئے اعتراض کے ان تین اصل نکات پر مختصراً بحث کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اسلام کے نقطہ نظر سے ہم اس اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے ان محدود صفحات میں بحث کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے ایک ایسا مسئلہ جو فلسفہ، فقہ تاریخ اور اجتماعیات سب ہی سے متعلق ہے ایک ضخیم کتاب کی وسعت چاہتا ہے جسے برسوں کے مطالعہ کا حاصل قرار دیا جاسکے۔ تاہم توقع ہے کہ یہ مختصر مقالہ اس اشکال کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔

جبر تاریخ

یہ کلمہ دو اجزاء سے مرکب ہے، جبر اور تاریخ۔ جبر کا مطلب کسی چیز کا حتمی اور یقینی ہونا ہے۔ فلاسفہ کی اصطلاح میں اسے ضرورت اور وجوب کہا جاتا ہے مثلاً جب ہم ۵ x ۵ کہتے ہیں تو یہ ضرب کھانے والے دونوں اعداد ضرورتاً اور جبراً ۲۵ کے مساوی ہوں گے یعنی حتماً ایسا ہی ہے اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جبر کا لفظ اصطلاحاً ایک فلسفیانہ مفہوم رکھا ہے۔ اس سے ہٹ کر جبر کا مفہوم حقوقی فقہی اور عرفی ہے یعنی یہ لفظ اکراہ اور جبریہ اعمال کیلئے استعمال کیا جاتا ہے ۵x۵ اپنی ذاتی ساخت کی بناء پر ۲۵ کے مساوی ہے یہ کسی جبری قوت اور جبریہ عمل کی وجہ سے نہیں ہے۔ لیکن تاریخ، تاریخ یعنی حادثات کا مجموعہ جو انسان کی سرگزشت کو تشکیل دیتا ہے انسانی سرگزشت ایک راستہ طے کرتی ہے۔ کچھ ایسی طاقتیں کارفرما ہیں جو اسے حرکت میں لاتی ہیں اور اسے قابو میں رکھتی ہیں جیسے ایک دستی پہیہ یا ایک کارخانہ جسے ہاتھ یا بھاپ کی طاقت سے چلایا جاتا ہے۔ تاریخ کو بھی کچھ عوامل اور طاقتیں حرکت میں رکھتی ہیں۔ اسے گردش میں لاتی ہیں اور آگے بڑھاتی ہیں۔ اس اعتبار سے جبر تاریخ کا طلب سرگزشت بشر کا حتمی اور پابند ہونا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخ خی حرکت جبری ی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں کچھ ایسے طاقتور عوامل ہیں جو اپنے قطعی اثرات رکھتے ہیں۔ ان سے بچنا ممکن نہیں ان عوامل کی تاثیر یقینی اور حتمی ہوتی ہے۔

جبر تاریخ کے کلمے نے ہمارے اس دور میں بڑی قدر و قیمت حاصل کر لی ہے۔ یہ کلمہ موجودہ زمانے میں وہی کردار ادا کر رہا ہے جو اس نے ماضی میں

قضاوقدر کے پردہ میں ادا کیا تھا حوادث زمانہ کے آگے سپر ڈال دینا اور اپنی غلطیوں کے غدر تراشنا اس کا مدعا ہے۔

یہ ایک شیر خونخوار ہے کہ اس کے مقابل تسلیم ورضا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ماضی میں اس کا نام قضاوقدر تھا اور موجودہ دور میں اسے جبر تاریخ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قضاء وقدر اور جبر تاریخ دونوں کلمہ صحیح فلسفیانہ مفہوم کے حامل ہیں ان کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھنا ہی غلط تغیر کا سبب بنا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب ''انسان وسرنوشت'' میں قضاء قدر کے بارے بحث کی ہے لیکن جبر تاریخ:

یہ کہ انسانی سرگزشت دنیا کے تمام حوادث کی طرح نہ تبدیل ہونے والا قانون رکھتی ہے اور تاریخی عوامل دوسرے تمام عوامل کی طرح قطعی اور لازمی تاثیرات رکھتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ قرآن کریم نے جو سنۃ اللہ کہہ کر اس کی تائید کی ہے لیکن ان عوامل کی تاثیر کی نوعیت اصل مسئلہ ہے۔ کیا تاریخ کے جبر عوامل کا اثر اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چیز وقتی محدود اور زوال پذیر ہو کر رہ جاتی ہے یا اس کی کوئی دوسری صورت بھی ہے؟

ظاہر ہے اس مسئلے کا تعلق عوامل کی نوعیت سے ہے۔ اگر تاریخ کو گردش میں لانے والے عوامل مضبوط اور پائیدار ہوں گے تو ان کی جبری تاثیر کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوگا کہ وہ گردش وتسلسل کو برقرار رکھیں گے۔ اگر اس کے برعکس یہ عوامل ناپائیدار ہوئے تو ان کے نتائج وآثار بھی ناپائیدار ہوں گے تاریخ عوامل میں سے ایک عامل کا تعلق خاندان اور جنس سے ہے۔ یہ ایک مضبوط اور پائیدار عامل ہے اور یہ ہمیشہ خاندان کی تشکیل رفیق زندگی انتخاب اور بچوں کی تولید میں موثر رہا ہے۔ تاریخ کے طویل دور میں خاندانی زندگی کے خلاف تھیں جبر تاریخ کا تقاضہ یہ تھا کہ خاندانی زندگی باقی رہے۔

ایک دوسرا تاریخی عامل مذہب ہے۔ پرستش انسان کی سرشت میں شامل ہے، یہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے۔ یہ عامل تاریخ کے تمام ادوار میں موثر رہا ہے اور اس نے مذہب پر سے توجہ کو ہٹنے نہیں دیا۔

غرض یہ کہ جبر تاریخ کو کسی محدود اور وقتی چیز کے مساوی قرار دے کر ہر قانون اور قاعدہ کی ناپائیداری پر دلیل لانا ایک بڑی غلطی ہے۔

جبر تاریخ اس جگہ ناپائیداری کو نتیجہ کی صورت میں سامنے لاتی ہے جہاں زیر نظر عامل جیسے اقتصادی پیداوار کا عامل، ناپائیدار ہو اور کوئی دوسرا عامل اس کی جگہ لے۔ اس لئے انسان اور اس کی ضروریات تاریخ کو گردش میں لانے والے عوامل اور ان میں سے ہر عامل کی معاشرہ پر اثر انداز ہونے والی تاثیری قوت کر سراغ لگانا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے اور ان میں سے کون سا عامل مضبوط وپائیدار ہے اور کون سا کمزور وناپائیدار۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی جملہ حالتوں کی ناپائیداری کو جبر تاریخ کے مساوی قرار دینے کا مفروضہ ہی انسان کے ''یک جہتی'' ہونے کے مفروضے کو آگے لانے کا سبب بنا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق ''یک جہت'' انسان زیادہ قدر وقیمت نہیں رکھتا اور تاریخ کا تغیر ایک ''یک شاخہ'' تغیر ہے۔ اس مفروضے کے حامیوں کے نقطہ نظر سے ہر دور میں تاریخ کا اصل اور بنیادی عامل معیشت ہے، دولت کی پیداوار اور تقسیم کا طریقہ، افراد کے اقتصادی روابط جیسے کارخانہ اور مزدور کسان اور زمیندار کے روابط (جو کمزور اور تغیر پذیر روابط ہیں) زندگی کی دوسرے گوشوں مثلاً دین علم، فلسفہ قانون، اخلاق اور ہنر کا تعین کرتے ہیں۔ ابتداً دنیا میں اس مفروضے کا بڑا چرچا ہوا لیکن اب یہ اپنی قدر وقیمت کھو چکا ہے۔ آج دنیا اور تاریخ کے بہت سے مادہ پرست مفسرین اس مفروضے کو مسترد کر چکے ہیں۔

ہر چند کہ ابھی علمی اعتبار سے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان ''یہ ناشناسا وجود'' کثیر الجہت ہے اور انسانی تاریخ کی توجیہ کثیر الجہت ، کے مفروضے سے ہی کی جاسکتی ہے، البتہ یہ تسلیم شدہ قدر ہے کہ انسان ''یک جہت'' نہیں ہے اس کے یک جہت ہونے کا نظریہ اور انسانی تاریخ کے سفر کا یک خطہ ہونے کا مفروضہ سب سے زیادہ بے بنیاد مفروضہ ہے۔

انسانی ضروریات

کیا یہ درست ہے کہ انسان کی تمام ضروریات بدلتی رہتی ہیں اور ضروریات کے تغیر کے ساتھ ان سے متعلق قوانین وضوابط میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تمام انسانی ضروریات حالت تغیر میں ہوتی ہیں اور نہ ضروریات کے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ زندگی کے بنیادی اصول اور ضوابط ہی میں تبدیلی آجائے۔

ضروریات کی پہلی قسم

ضروریات دوطرح کی ہیں: بنیادی ضروریات اور ثانوی ضروریات......

بنیادی ضروریات انسان کی جسمانی وروحانی ساخت اور اجتماعی زندگی کے مزاج کی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے اور اجتماعی زندگی بسر کررہا ہے اس کی یہ ضروریات باقی رہیں گی۔ یہ ضروریات تین طرح کی ہیں جسمانی روحانی اور اجتماعی:

۱۔ جسمانی ضروریات کا تعلق خوراک، پوشاک، مسکن اور رفیق حیات سے ہے۔

۲۔ روحانی ضروریات کے ذیل میں علم، زیبائش، نیک، پرستش، احترام

وتربیت آتے ہیں، اور۔

۳۔ معاشرت، مبادلۂ اشیاء تعاون، عدالت، آزادی اور مساوات کا تعلق اجتماعی ضروریات سے ہے۔

ثانوی ضروریات

وہ ضروریات ہیں جو بنیادی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں مختلف آلات اور وسائل زندگی کی ضروریات اسی نوع کی بنیادی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

یہ بنیادی ضروریات ہی ہیں جو انسان کی زندگی کی توسیع اور ترقی کی جانب قدم بڑھانے کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔ ثانوی ضروریات زندگی کی توسیع وترقی سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ زیادہ سے زیادہ توسیع وترقی کیلئے محرک ثابت ہوتی ہیں۔

ضروریات میں تغیر اور ان کے نئے ہونے اور پرانے ہونے کا تعلق ثانوی ضروریات سے ہے۔ بنیادی ضروریات نہ پرانی ہوتی ہیں اور نہ ختم ہوتی ہیں وہ ہمیشہ زندہ اور نئی رہتی ہیں۔

ثانوی ضروریات کا ایک حصہ بھی ایسا ہی ہے۔ قانون کی ضروریات ثانوی ضروریات کے اسی حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ قانون کی ضرورت اجتماعی زندگی کی بنیادی ضرورت کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور اسے بھی دوام اور ہمیشگی حاصل ہے۔ انسان کسی دور میں بھی قانون سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

ضروریات کی دوسری قسم

یہ بات صحیح ہے کہ تمدن کے عوامل میں توسیع نئی نئی ضروریات کو سامنے لاتی

ہے اور وقتاً فوقتاً فرعی قوانین ضوابط ومعاہدات کا ایک سلسلہ وجود میں آتا رہتا ہے ،مثلاً نقل وحمل کے مشینی وسائل کی بنا پر یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ شہروں کے درمیان آمدروفت کیلئے اور مختلف ممالک کے درمیان سفر اور نقل وحمل کیلئے کچھ قوانین وضوابط وضع کئے جائیں جب کہ ماضی میں اس طرح کے قوانین اور معاہدوں کی ضرورت نہیں تھی البتہ تمدن کے عوامل میں توسیع حقوقی تعزیری اور شہری قوانین جن کا تعلق لین دین ،وکالتوں ناجائز قبضوں ،ضمانتوں ،وارثت ازدواج اور ایسے ہی دوسرے امور سے ہوتا ہے۔اگر وہ فی الواقع عدالت اور فطری حقوق پر مبنی ہوں تو پھر انہیں تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب یہ ضرورت ہے تو خدا کے ساتھ انسان کے رابطے یا فطرت کے ساتھ انسان کے رابطے سے متعلق قوانین کی تبدیل کا سوال کیسے پیدا ہوگا۔

قانون ضروریات کی تکمیل کا شریفانہ اور عادلانہ طریقہ مقرر کرتا ہے وسائل وآلات ضرورت کی تبدیلی ان کے حصول واستفادہ اوران کے عادلانہ تبادلے کے طریقے کو تبدیل کرنے کا سبب نہیں بنتی ۔مگر یہ فرض کرلیا جائے کہ زندگی کے اسباب ،وسائل اورآلات میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ترقی وکمال کی صورت اختیار کرتے ہیں تو حق انصاف اور اخلاق کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے ۔دوسرے الفاظ میں ہم کو یہ فرض کرنا پڑے گا کہ حق ،عدالت اور اخلاق کے مفاہیم اضافی ہیں ۔ایک چیز اگر کسی زمانے میں حق ،عدالت اور اخلاق کے ذیل میں آتی ہے تو دوسرے زمانے میں وہ حق عدالت اور اخلاق کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔

ہمارے دور میں اس مفروضے کا بڑا چرچا ہے لیکن اس سلسلہ بیان میں اس مسئلے پر بحث کی زیادہ گنجائش ہے۔ یہاں ہم صرف یہ کہیں گے کہ اس مفروضے کا سبب حق ،عدالت اور اخلاق کے حقیقی مفہوم سے ناواقفیت ہے۔حق عدالت اور اخلاق کے ذیل میں

جو چیز تغیر پذیر ہے وہ ان کا نفاذ اور ان کی عملی صورت ہے نہ کہ ان کی حقیقت وماہیت۔

اگر کوئی آئین ودستور حقوق اور فطرت کی بنیاد پر بنایا گیا ہو تو وہ ایک زندہ انقلابی قوت سے بہرہ مند ہوگا وہ زندگی کی اس شکل وصورت سے بحث کرنے کی بجائے جس کا تعلق بظاہر تمدن سے ہے ،زندگی کیلئے اصلی اور حقیقی خطوط کھینچے گا ،وہ نہ صرف زندگی کے تغیرات سے ہم آہنگ ہوگا بلکہ ان کی رہنمائی کرے گا۔

نئی نئی ضروریات اور قوانین کے درمیان تضاد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ قانون حرکت وعمل کی راہ متعین کرنے کی بجائے زندگی کی ظاہری شکل وصورت پر توجہ دے۔ مثلاً مخصوص آلات اور وسائل کو جن کا تعلق سارے کا سارا تہذیب وتمدن کے مراحل سے ہوتا ہے انہیں ہمیشہ ایک ہی صورت میں رکھنا چاہیے۔

اگر قانون یہ چاہے کہ ہمیشہ تحریری کام ہاتھ ہی سے کیا جائے گھوڑے اور خچر ہی سے سواری کا کام لیا جائے اور روشنی کیلئے مٹی کے تیل کی قندیل ہی استعمال کی جائے اور صرف وہی کپڑا پہنا جائے جو ہاتھ سے بنا جاتا ہے۔اس طرح کا قانون علم وتمدن کی توسیع اور اس سے پیدا ہونے والی احتیاجات سے جنگ کرتا ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جبر تاریخ اس قانون کو بدل کر رکھ دے گا۔

قانون جس قدر جزئی اور مادی ہوگا یعنی مخصوص مواد ورنگ اور مخصوص صورتوں کا حامل ہوگا اس کے بقاء ودوام کے امکانات کم ہی ہوں گے۔اس کے برعکس قانون جس قدر کلی اور معنوی ہوگا اور اشیاء کی ظاہری صورتوں پر توجہ دینے کی بجائے اشیاء کے درمیان یا اشخاص کے مابین روابط پر توجہ دے گا اس کے بقاء ودوام کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

زمانے کے تقاضے

زمانے تقاضے یعنی ماحول معاشرہ اورزندگی کے تقاضے انسان عقل ایجادو اختیار کی قوت سے لیس ہے اور بہتر زندگی کی خواہش رکھتا ہے۔اسی لئے وہ اپنی اقتصادی ،اجتماعی ،اورمعنوی ضروریات رفع کرنے کیلئے بہتر سے بہتر افکار ونظریات اورعوامل ووسائل کا کارراز حیات میں لانے کی کوشش کرتا ہے ۔بہتر اور کامل تر وسائل وعوامل کی زندگی میں آمد خود بخود پرانے اور ناقص تر عوامل کو اپنی جگہ خالی کردینے پر مجبور کرتی ہے اس طرح انسان جدید عوامل اوران کی مخصوص ضروریات سے وابستگی پیدا کرلیتا ہے۔انسان کی مادی اور معنوں احتیاجات کے ایک سلسلے سے وابستگی اوران احتیاجات کورفع کرنے والے عوامل ووسائل کا دائمی تغیراوران وسائل کا ہمیشہ بہتر ہوتے چلے جانااور ایک مرحلے پرخودان کا نئی نئی احتیاجات کے ایک سلسلے کو وجود میں لانا ہر دوراورزمانے میں ماحول اجتماعی اورزندگی کے تقاضوں میں تغیر کا سبب بنتا رہتا ہے اورانسان کولازمی طو پر جدید تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے پرآمادہ کرتا رہتا ہے۔اس طرح کے تقاضوں سے جنگ نہیں کرنی چاہیے اور نہ جنگ کی جاسکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ کسی عہد کے دوران پیدا ہونے والے مظاہر بہتر افکار ونظریات اورکامل تر وسائل وعوامل کے اعتبار سے زندگی کیلئے زیادہ سعادت بخش نہیں ہوتے۔ یہ انسان ہی جو اپنے زمانے ،ماحول اور معاشرہ کو تشکیل دیتا ہے اورانسان غلطی سے محفوظ نہیں ہے۔اس اعتبار سے انسان کی صرف یہی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ وقت کے دہارے پر بہتا چلا جائے اوراپنے دور کے افکار ونظریات ،عادات واطوار اور پسند ونا پسند کواپنا تا چلا جائے ۔اس کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے وقت کی باگ دوڑ

اپنے ہاتھ میں لے اورزمانے کی اصلاح کرے۔اگرانسان خود کوصدفی صد زمانے کے مطابق بناتا رہے گاتو پھروہ زمانے کوکس چیز سے ہم آہنگ کرے گا؟

افلاس فکر رکھنے والے افراد کیلئے ''زمانے کے تقاضے'' یعنی ''آج کی پسند اورسلیقہ'' اور یہ جملہ'' آج کی دنیا پسند نہیں کرتی '' ہرنظری عملی ،صوری ،مادی ،قیاسی ،تجربی اوراستقرائی منطق کی رو سے ان کی شخصیت کو متاثر کرنے اوران کے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کردینے کیلئے بہت کافی ہے۔ان لوگوں کے طرز فکری کی رو سے خصوصاً دنیائے مغرب میں کسی چیز کا فیشن اورسلیقہ قرار پانا یہ کہنے کیلئے کافی ہے کہ زمانے کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ان کے نزدیک یہ جبر تاریخ ہے اس سے بچنا ممکن نہیں بلندی وترقی کیلئے اسے اختیار کرنا لازم ہے۔حالانکہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے زمانے ماحول اوراجتماعی عوامل کو تشکیل دیتا ہے۔ یہ چیزیں عالم قدس سے نازل نہیں ہوتیں۔انسان خواہ وہ مغرب کا رہنے والا ہی کیوں نہ ہو،غلطی کا سزاوار ہے۔

انسان عقلی اورعلم سے آراستہ ہونے کے ساتھ شہوت اورخواہش نفس بھی رکھتا ہے۔مصلحت اوزندگی کی طرف وہ اچھے قدم اٹھایا ہے توکبھی کبھی اس کے قدم غلط سمت پربھی اٹھ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے زمانہ جہان راہ راست پر پیش قدمی کرسکتا ہے وہاں وہ راہ انحراف بھی اختیار کرسکتا ہے۔اس لئے جہاں زمانے کی ایسی پیش قدمیوں کا ساتھ دینا چاہیے وہاں اس کے انحرافات کی مزاحمت بھی کرنی چاہیے۔

لفظ'' آزادی'' کی طرح ''زمانے کے تقاضے'' ان کلمات میں سے ایک ہے جن کا مشرق کی سرزمین پر بڑا ابراحشر ہوا ہے اورآج یہ کلمہ استعمار کا ایک ایسا مکمل ہتھیار ہے جس سے وہ مشرق کی اصل تہذیب پرضرب لگانے اوراس پرمغربی روح مسلط کرنے کا کام لیتا ہے۔کتنے فریب ہیں جواس عنوان سے دیئے جاتے ہیں اورکتنی بدبختیاں ہیں جواس خوبصورت کتبہ کے ساتھ ہم پرمسلط کی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ علم کا ہے، بلاشبہ یہ بات درست ہے لیکن کیا اس سرچشمہ علم کے علاوہ دوسرے تمام سرچشمے انسان کیلئے خشک ہو چکے ہیں اور آج جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ صحیح و خالص علم کی حیثیت رکھتا ہے؟ آخر کس دور میں ہمارے اس عہد کی مانند علم و دانش کو اس قدر قوت وقدرت اور وسعت حاصل رہی ہے اور کس زمانے میں اس دور کی طرح علم و دانش اپنی آزادی سے محروم ہو کر شہرت کے عفریت کی غلام اور خودغرضی، جاہ طلبی، زر پرستی و استحصال کے اژدھوں کا شکار رہے ہیں؟

جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ زمانے کے تغیر پذیر تقاضے کسی قانون کو ہمیشہ کیلئے باقی نہیں رہنے دیتے انہیں چاہیے متذکرہ بالا دو موضوعات کو ایک دوسرے سے الگ کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اسلام میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بہتر زندگی کی جانب پیش قدمی کی مخالف ہو۔

ہمارے اس دور کی مشکل یہ ہے کہ آج کے انسان کو ان دونوں باتوں کو الگ کر کے غور کرنے کی بہت کم توفیق ہوتی ہے، وہ قدیم کے ساتھ رشتہ جوڑ کو جمود اختیار کر لیتا ہے اور جو کچھ نیا ہو اس سے لڑنے لگتا ہے یا پھر اس قدر جہالت پر اتر آتا ہے کہ ہر نئی ظاہر ہونے والی چیز کو ''زمانے کے تقاضوں'' کے نام پر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔

حرکت و لچک

بعض مسائل: جبر تاریخ............ضروریات زندگی میں تغیر......زمانے کے تقاضے............ یہ تینوں باتیں ہمارے لئے صرف یہ جاننے کیلئے مفید ہیں کہ ہم ان باتوں کو بہانہ بنا کر اور آنکھیں بند کر کے کسی قانون کو ہدف نہیں بنا سکتے اور اس کی ابدیت کے منکر نہیں ہو سکتے۔

واضح ہے کہ صرف ان مسائل پر بحث قانون کی ابدیت کے مسئلے کی شکل حل کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یقیناً اگر کوئی ابدی قانون زندگی کی تمام متغیر صورتوں کا احاطہ کرنا چاہے اور تمام مشکلات کے حل کرنے کی راہ دکھائے اور ہر مشکل کو بہتر طریقے پر رفع کر دے تو اسے قوت و حرکت کے ساتھ ایک لچک سے بھی بہرہ مند ہونا چاہیے وہ خشک جامد اور بے لچک نہ ہو۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام اپنی اس اصل کی حفاظت کرتے ہوئے ''حلال محمد حلال الیٰ القیامۃ وحرام محمد حرام الیٰ یوم القیامۃ زندگی کے مختلف مسائل کے حل کی راہ کسی طرح دکھاتا ہے۔

یقیناً اسلام کے قانون سازی کے نظام میں کوئی راز اور رمز چھپا ہوا ہے جو اس بڑی مشکل پر قابو پا لیتا ہے۔

اسلام کی منطقی روح کے تمام بھیدوں اور رازوں کا سرچشمہ اس انسان کی فطرت و طبیعت اجتماعیت اور پورے عالم کے ساتھ کامل وابستگی ہے۔

اسلام نے اپنے قوانین وضوابط کے وضع کرنے میں فطرت کے احترام اور فطری قوانین کے ساتھ وابستگی کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا ہے۔ اسلام کی یہی وہ

جہت ہے جس نے قوانین اسلام کے ابدی ہونے کا امکان پیدا کر دیا ہے۔

فطرت کے ساتھ اسلام کی وابستگی اور رابط کو مندرجہ ذیل نکات سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ا۔حریم دین میں عقل کو جگہ دینا

دنیا کے کسی دین نے اسلام کی طرح عقل کے ساتھ اس قدر قریبی رشتہ نہیں رکھا ہے اور اس کے ''حق'' کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ کس دین کا نام لیا جاسکتا ہے کہ جس نے عقل کو اپنے احکام کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ قرار دیا ہو۔ فقہائے اسلام نے احکام کے چار سرچشمے اور ذریعے قرار دیئے ہیں۔ کتاب، سنت اجماع، عقل فقہائے اسلام عقل اور شرع کے درمیان نا قابل شکست رشتے کے قائل ہیں اور اسے ایک لازمی اصول قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

کل ماحکم به العقل حکم به الشرع وکل ماحکم به الشرع حکم به العقل

جو کچھ عقل سلیم حکم کرتی ہے شرع بھی اسی کے مطابق حکم کرتی ہے اور جس چیز کا شرع حکم دیتی ہے عقل بھی اس کا حکم کرتی ہے۔

فقہ اسلامی میں خود عقل کسی قانون کو منکشف کرنے والی ہوسکتی ہے اور وہ کسی قانون میں قیود وحدود وضع کرسکتی ہے یا اس قانون میں عمومیت پیدا کرسکتی ہے اور تمام سرچشموں اور ذرائع سے استنباط کرنے میں بڑی اچھی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

عقل کی دخل اندازی کا حق اس طرح پیدا ہوا ہے کہ اسلامی قوانین زندگی کی حقیقت سے سروکار رکھتے ہیں۔ اسلام اپنی تعلیمات میں ایسی مجہول پر اسراریت اور مزیت کا قائل نہیں ہے، جسے حل نہ کیا جاسکتا ہو۔

۲۔جامعیت اور خود قرآن کی تعبیر کے مطابق وسطیت

کسی مکتب قانون کا یک طرفہ ہونا خود اپنے اندر اپنی تنسیخ کی دلیل رکھتا ہے انسان کی زندگی پر غلبہ رکھنے والے اور اثر انداز ہونے والے عوامل بہت زیادہ ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی صرف نظر کرنا خود عدم تعاول پیدا کرتا ہے۔ قوانین کے ابدی ہونے کا سب سے اہم عنصر ان کا تمام مادی، روحانی، انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر محیط ہونا ہے۔ تعلیمات اسلامی کی جامعیت اور ہمہ جہتی کی صفت ہی اسلام سے شناسا ہونے والوں کے درمیان اس کی مقبولیت کا سبب ہے۔ اس نکتہ پر تفصیلی بحث ہماری اس گفتگو کے دائرے سے باہر ہے۔

۳۔اسلام نے کبھی زندگی کی ظاہری شکل وصورت سے بحث نہیں کی

تمام اسلامی تعلیمات نے روح اور معانی پر اور اس طریقے توجہ دی ہے جو انسان کو ان مقاصد ومعانی تک پہنچاتا ہے۔ اسلام نے مقاصد ومعانی اور ان تک پہنچنے کے طریقے کی طرف رہنمائی اپنے ذمے لینے کے بعد انسان کو اس کے علاوہ دوسرے امور میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح اس نے تہذیب وتمدن کے توسیعی عمل کے ساتھ تصادم سے پرہیز کیا ہے۔

اسلام میں کوئی مادی وسیلہ اور کوئی ظاہری شکل نہیں ملے گی۔ جسے تقدس حاصل ہو اور مسلمان کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس شکل اور ظاہر کی حفاظت کرے۔ اس

اعتبار سے علم وتمدن کے توسیعی مظاہر کے ساتھ تصادم سے پرہیز اسلام کی ایک ایسی جہت ہے کہ اس نے زمانے کے تقاضوں پر دین کو منطبق کرنے کا کام آسان کر دیا ہے اور اپنی ابدیت کی راہ میں حائل ہونے والی ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔

۴۔اس دین کی خاتمیت اور ابدیت

اس دین کی خاتمیت اور ابدیت کا ایک دوسرا رمز یہ ہے کہ وہ قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے قوت حاصل کرتا ہے اس نے انسان کی مستقل اور دائمی ضروریات کیلئے مستقل اور غیر متبدل قوانین بنائے ہیں اور تغیر پذیر حالات اور صورتوں کیلئے اس نے قابل تغیر وضع قانون کی پیش بینی کی ہے۔

سطور بالا میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض انسانی ضروریات خواہ کا تعلق انفرادی شعبوں سے ہو یا اجتماعی شعبوں سے اپنی ایک مستقل صورت رکھتی ہیں اور وہ تمام انسانوں میں یکساں ہوتی ہیں۔ انسان اپنی جبلتوں اور عادتوں کیلئے جو نظام وضع کرتا ہے وہ اخلاق کہلاتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے جو نظام تشکیل دیتا ہے اسے عدالت کا نام دیا جاتا ہے اور وہ اپنے خالق سے جو رابط قائم کرتا ہے اور اپنے ایمان کی تجدید وتکمیل کرتا ہے اسے عبادت کہتے ہیں۔ ان تینوں کا تعلق ان مستقل قسم کی ضروریات سے ہے۔

انسان کی بعض دوسری ضروریات تغیر پذیر ہوتی ہیں، جو قانون کے لحاظ سے ایسی قانون سازی کو لازم کرتی ہیں جس میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اسلام نے ایسی تغیر پذر احتیاجات کیلئے وضع قانون کی لچکدار صورت اختیار کی ہے۔ اس طرح نے قابل تغیر حالات کیلئے قانون سازی کو مستقل اور غیر متبدل اصولوں کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور وہ اصول ہر تغیر پذیر نئی صورت حال میں خاص اور متناسب فرعی قانون

کو وجود میں لاتے ہیں۔

ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

اسلام میں ایک اجتماعی اصول یہ ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ

یعنی آخری امکانی حد تک دشمن کے مقابل قوت فراہم کرو اور طاقتور بن کر رہو۔ (سورہ انفال۔60)

یعنی کتاب قرآن ہمیں اس اصول کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسری طرح سنت سے ہمیں ہدایات کا ایک سلسلہ ملتا ہے کہ فقہ میں یہ ہدایات ''سبق ورمایۃ'' کے عنوان سے معروف ہیں۔ ہدایت کی گئی ہے مسلمان اور ان کے فرزند گھوڑے سواری اور تیراندازی میں کامل مہارت حاصل کریں۔ گھوڑے سواری اور تیراندازی اس دور کے فنون حرب کا ایک اہم جز تھے اور دشمن کے مقابل قوت کی فراہمی اور طاقتور بننے کا بہترین ذریعہ تھے ''سبق ورمایۃ'' کے قانون کی اصل تو قرآن کا یہ حکم ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ہے یعنی اسلام کے نقطہ نظر سے تیر، تلوار اور گھوڑا اصلیت نہیں رکھتے، یہ اسلامی مقاصد کا جز نہیں ہیں۔ جو بات اصلیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر دور اور زمانے میں دشمن کے مقابل اپنے فوجی اور دفاعی وسائل کو آخری حد امکان تک مضبوط اور طاقتور بنانا چاہیے۔

درحقیقت تیراندازی اور گھوڑا دوڑانے میں مہارت ایک لباس ہے۔ جو دشمن کے مقابل طاقت کے جسم کو پنایا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تیراندازی مہارت اس زمانے میں طاقتور بننے کی ایک عملی صورت تھی دشمن کے مقابل طاقتور بننے کا لزوم ایک مستقل قانون کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دائمی اور مستقل ضرورت سے

قوت حاصل کرنا ہے لیکن تیراندازی اوراسب دوانی ایک وقتی ضرورت کا مظہر ہیں اورزمانے کے تقاضوں اورتہذیبی وفنی عوامل کی توسیع کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے اوردوسری چیزیں جیسے آج کے جدید اسلحہ کے استعمال میں مہارت کا حصول ان کی جگہ لے لیتی ہے۔

دوسری مثال پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

''علم ودانش کا حصول ہر مسلمان پر واجب ہے۔''

حکماء اسلام نے یہ ثابت کیا ہے کہ علم ودانش کا حصول اسلامی نقطہ نظر سے دوصورتوں میں واجب ہے:

ایک اس صورت میں جب کہ ایمان کا حصول علم ودانش سے وابستہ ہو۔

دوسرے اس وقت جب کسی ذمہ داری کا پورا کرنا علم ودانش کے حصول پر منحصر ہو۔

دوسری صورت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ طلب دانش کا واجب ہونا تیاری کیلئے ہے کہ انسان کسی ذمہ داری کے ادا کرنے کی قابلیت پیدا کرے۔

اسی لئے علوم کے حصول کا واجب ہونا یا واجب نہ ہونا زمانے کے تقاضوں کے مطابق مختلف ہوجاتا ہے۔پچھلے بعض ادوار میں اسلامی فرائض کی ادائیگی حتیٰ کہ اجتماعی فرائض جیسے تجارت،صنعت وسیاست کیلئے دانش کا حصول زیادہ ضروری نہیں تھا اس کیلئے عام تجربات کافی تھے،ہمارے زمانے کی طرح بعض دوسرے زمانوں میں ان فرائض کی ادائیگی اس قدر دشوار اورپیچیدہ رہی ہے کہ اس کیلئے برسوں تعلیم اورخصوص تربیت لازمی قرار پائی تاکہ اسلامی اجتماعی فرائض (واجبات کفائی) انجام پاسکیں۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی اقتصادی اورفنی علوم کی تحصیل جوایک دور میں واجب نہیں تھی ،دوسرے دور میں واجب ہوجاتی ہے۔ایسا کیوں؟ اسلامی معاشرہ کے استقلال عزت اورحیثیت کے تحفظ کے لازمی اصول پر عمل کرنا ایک مستقل اوردائمی

اساس کی حیثیت رکھتا ہے اورموجودہ دور کے حالات میں تحصیل وتکمیل دانش کے بغیر اس اصول پر پوری طرح عمل نہیں کیا جاسکتا ،اس فرض کی ادائیگی مختلف زمانوں اورمختلف حالات میں یکساں شکل میں نہیں رہی ہے۔اس سلسلے میں بہت مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

۵۔اسلامی تعلیمات کی فطرت اورطبیعت کیساتھ ہم آہنگی

ایک دوسرا پہلو جوفطرت اورطبیعت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی ہم آہنگی کی علامت ہے اورجس کی وجہ سے اسلامی قوانین کی ابدیت کا امکان پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی مصالح اورمفاسد کے ساتھ احکام اسلامی کا علت ومعلول کا رابط اوراس رو سے احکام کی درجہ بندی ہے۔

اسلام نے یہ واضح کیا ہے کہ احکام حقیقی مصالح ومقاصد کے ایک سلسلہ کے تابع ہیں اوریہ بھی بتادیا گیا ہے کہ یہ مصالح ومقاصد ایک درجے میں نہیں رکھے جاتے۔

اسی وجہ سے فقہ اسلامی میں ایک مخصوص باب بابِ ''تزاحم'' یا ''اہم ومہم'' رکھا گیا ہے تاکہ فقہا اوراسلامی کارکنوں کیلئے مختلف مصالح ومفاسد کے یکجا ہونے اوران سے واسطہ پڑنے کی صورت میں آسانی حاصل ہو۔اسلام نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اس طرح کے مواقع پر علمائے امت مصلحتوں کی اہمیت کے درجوں کا خود اسلام کی رہنمائی میں پوری توجہ کے ساتھ یقین کریں اورزیادہ اہم مصالح کو کم اہمیت والے مصالح پر ترجیح دیں اورتعطل کی حالت سے باہر نکل آئیں۔

رسول اکرمؐ سے روایت ہے:

اذا اجتمعت حرمتان طرحت الصغریٰ الکبریٰ

جہاں دو امور واجب الاحترام جمع ہو جائیں تو بڑے امر کی خاطر چھوٹے امر صرف نظر کرنا چاہیے۔

ابن کثیر ''الہنایہ'' میں اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں جماعت کا فائدہ اور فرد کا نقصان ہو رہا ہو تو جماعت کا مفاد فرد کا نقصان پر مقدم ہے۔''

جو کچھ ابن کثیر نے کہا ہے وہ زیادہ اہم مصلحت کو کم اہمیت والے مصلحت پر مقدم رکھنے کے ایک موقع سے متعلق ہے، حدیث کا فائدہ اسی موقع تک محدود نہیں ہے۔ مردہ جسم کے اعضاء کی تشریح (ANTAONY) کے علم کو ہمارے دور میں علم کی ترقی کیلئے ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس کا تعلق باب ''تزاحم'' سے ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اسلام نے مسلمان کے بدن کے احترام اور مراسم تجہیز میں عجلت کو لازم قرار دیا ہے جب ک ہمارے زمانے میں طب کی تعلیم و تحقیق کے ایک حصے کا انحصار تشریح اعضاء پر ہے۔ اس طرح دو مصلحتیں ایک دوسرے کے مقابل آ گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ طبی احتیاط کے ساتھ کہ غیر مسلم کی لاشوں کے کافی نہ ہونے کی صورت میں مسلمان کی لاش پر انحصار کیا جائے اور پہچانی جانے والی لاش کو چھوڑ کر نہ پہچانی جانے والی لاش استعمال کی جائے۔ اسی طرح بعض دوسری باتوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس طرح ''اہم و مہم'' کے قاعدہ کے تحت مسلمان لاش کے اعضاء کی تشریح کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔

اس قاعدہ تحت بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

٦۔ اسلامی قوانین کو لچکدار بنانے والے قواعد کا وجود

ایک دوسری چیز جس نے اسلامی ضوابط کو لچک حرکت اور تطبیق کی خاصیت عطا کی ہے اور ان کی ہمیشگی کو برقرار رکھا ہے۔ بعض کنٹرول کرنے والے قواعد کے سلسلے کی موجودگی ہے جسے اسلامی قوانین کے متن میں مشامل کیا ہے۔ فقہاء نے ان قواعد کا بڑا اچھا نام رکھا ہے اور انہیں ''حاکمہ'' کہتے ہیں یعنی دو قواعد جو تمام اسلامی احکام و ضوابط پر بالا دستی رکھتے ہیں اور ان سب پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ قواعد اعلیٰ مناصب رکھنے والے انسپکٹروں کی طرح تمام احکام و ضوابط کی نگرانی کرتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرتے ہیں۔ قاعدہ ''حرج'' اور قاعدہ ''لاضرر'' ان ہی نگرانی قواعد (حاکمہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت اسلام نے ان نگران قواعد کو ویٹو کا حق دیا ہے ان قواعد کی داستان بڑی دلچسپ اور مفصل ہے۔

٧۔ اسلام کا اسلامی حکومت کو بعض مخصوص اختیارت دینا

کچھ دوسرے اختیارات ہیں جو اسلام نے حکومت اسلامی کو اور دوسرے الفاظ میں اجتماعی اسلامی کو دیئے ہیں۔ یہ اختیارات ابتدائی درجہ میں خود پیغمبر ﷺ کی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد امامؑ کی حکومت سے ان کا تعلق ہے پھر ہر شرعی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

پیغمبر خود مومنین سے زیادہ ان کے نفوس پر تسلط کا حق رکھتا ہے۔

(سورہ احزاب۔6)

یہ اختیارات ایک وسیع دائرہ رکھتے ہیں ۔اسلامی حکومت جدید حالات اور جدید ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کے اساسی اصول ومبانی پر توجہ کر کے ضوابط کا ایک سلسلہ وضع کر سکتی ہے کہ ماضی میں موضوعاً موجود نہیں رہے ہیں ۔[1]

حکومت اسلامی کی قوت کیلئے ان اختیارات کا وجود لازمی شرط ہے تا کہ وہ آسمانی قوانین کا بہتر طریقہ پر اجزاء اور انہیں بہتر انداز میں زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے اور ہر دور کے مخصوص لائحہ عمل کو بہتر طور پر مرتب ومنظم کر سکے۔ یہ اختیارات کچھ حدود وشرائط رکھتے ہیں کہ یہاں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔

[1] رجوع کیجئے ''تنبیہ الامہ'' مرحوم آیۃ اللہ نائنی ،صفحات 97۔102 اور مقالہ ''ولایت وزعامت'' علامہ طباطبائی کے قلم سے، کتاب ''مرجعیت وروحانیت'' چاپ دوم میں صفحات 82 تا 84

ذمہ داری کی منتقلی

ہماری گزشتہ باتوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان کا عقلی وعلمی بلوغ اوراس کی توانائی کے نئے دور کا آغاز جس میں اس پر الٰہی قوانین ومعارف کے تمام حقائق روشن ہوئے اور دینی ورثوں کی حفاظت ،تحریفات اور بدعتوں کے خلاف جنگ دین کی اشاعت تبلیغ اور دعوت کا کام انجام پایا۔ختم نبوت کا اصل بنیادی پس منظر ہے انسان کے دور اول میں مجبوراً ''وحی'' نے جو ذمہ داری عمدہ طریقے پر پوری کی تھی اسے رشد وبلوغ عقل وعلم کے دور میں علمی وعقلی قوت انجام دیتی ہے اور علماء انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں۔

علمائے اسلام کی ذمہ داری

باوجودیکہ اسلام رائج مذاہب کی روایات کے برعکس علمائے امت کیلئے کسی ایسے اختیار کا قائل نہیں ہے جو طبقاتی امتیاز پر منتج ہو، دین کی بڑی اہم ترین ذمہ داری ان کے شانوں پر عائد کی ہے۔ اسلام کی طرح کسی دین میں علماء نے ایسا موثر اور حقیقی نقش مرتسم نہیں کیا ہے اور یہ اس دین کی خاتمیت سے حاصل ہونے والے خصوصیت ہے۔ اولین منصب جو خاتمیت کے دور میں پیغمبروں کی طرف سے علماء امت کی جانب منتقل ہوا ہے وہ دعوت تبلیغ ارشاد اور تحریفات وبدعات کے خلاف جنگ کا منصب ہے۔

انسانی گروہ تمام زمانوں میں دعوت وارشاد کے محتاج رہے ہیں ۔قرآن نے صراحت کے ساتھ اس ذمہ داری کو خود امت کے ایک گروہ پر ڈالا ہے:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ

تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔(سورہ آل عمران۔104)

وہ اسباب ہر وقت موجود رہے ہیں جو تحریفات وبدعت پر منتج ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ یہ علماء امت ہی کی ذمہ داری ہے کہ تحریفوں اور بدعتوں کے خلاف جنگ کریں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اذاظھرت البدعی فعل العالم یظھرعلم ومن لم یفعل فعلیه لعنة الله

جب بدعتیں ظاہر ہوں یہ عالم کی ذمہ داری ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہیں کرے گا اس پر خدا کی لعنت۔

جو چیز تحریفات و بدعات کے خلاف جنگ کیلئے ممکن اور اس کے کام کو آسان بناتی ہے وہ اصلی معیار و مقیاس یعنی قرآن کا محفوظ رہنا ہے۔ رسول اکرمؐ نے خاص طور پر تاکید کی ہے جو کچھ آپ کی زبان سے نقل ہوا ہے اس کے صحت وسقم کو معلوم کرنے کیلئے قرآن کی کسوٹی سے فائدہ اٹھایا جائے۔

کتابوں کے اصل متن کو حوادث کے دستبرد سے محفوظ رکھنا، اصول سے فروع کا استنباط جزئیات پر کلیات کا انطباق ہر دور کے جدید مسائل کی دریافت ان پر غور و بحث، یکطرفہ رجحانات کا سد باب، صورتوں، ظواہر اور عادتوں پر جمود کے خلاف جنگ، فرعی ضوابط اور نتیجہ سے اصل اور مستقل احکام کو الگ کرنا۔ اہم ومہم کی تشخیص اور اہم کو ترجیح دینا وقتی قوانین کے وضع کرنے میں حکومت کے اختیارات کے حدود کا تعین زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ لائحہ عمل کی تیاری ختم نبوت کے اس

دور میں علماء کے اہم فرائض ہیں۔

امت اسلامیہ کے علماء اپنی ذمہ داری اور اہم منصب کے پیش نظر اپنے زمانے کے سب سے زیادہ عالم افراد ہونے چاہئیں کیونکہ وہ انسانوں کے اخلاقی انحرافات اور روحانی انحطاط کے مقتضیات سے وقت کے حقیقی مقتضیات کو جدا کر کے ان کی ٹھیک ٹھیک تشخیص اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ زمانے کی روح سے زمانے کی ساخت میں کارفرما عوامل اور ان عوامل کی سمت سفر سے اچھی طرح واقف نہ ہوں۔

اجتہاد

علماء امت کی اہم ذمہ داری اور فرائض میں سے ایک اجتہاد بھی ہے۔

اجتہاد کا مطلب صحیح طریقے سے وہ عالمانہ کوشش ہے جو کتاب ،سنت اجماع اور عقل کے سرچشموں سے استفادہ کر کے اسلام کے اصول وضوابط معلوم کرنے کیلئے کی جاتی ہے۔

اجتہاد کا لفظ پہلی بار احادیث نبوی میں استعمال ہوا پھر مسلمانوں میں اس کارواج ہوگیا۔ قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا۔روح معنی کے لحاظ سے جولفظ اس کا مترادف ہے اور قرآن میں بھی آیا ہے وہ تفقہ ہے قرآن نے صراحت کے ساتھ تفقہ ،دین کا گہرا فہم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔

اجتہاد یا تفقہ سے خاتمیت کے اس دور میں بہت نازک بنیادی ذمہ داری وابستہ ہے اور اسلام کی ابدیت کیلئے اسے ایک اہم شرط کی حیثیت حاصل ہے۔اجتہاد کو اسلام کی قوت محرکہ کہا گیا جو بالکل درست ہے ، بزرگ مسلمان فلسفی ابن سینا نے بڑی روشن فکری کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں:

اسلامی کلیات مستقل ،غیر متغیر اور محدود ہیں لیکن حوادث ومسائل غیر محدود اور متغیر ہیں اور ہر دور مخصوص تقاضوں اور مخصوص مسائل کا حامل ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر دور اور عہد میں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ماہر اسلامی کلیات کے عالم زمانے کو درپیش مسائل سے آگاہ اور جو کلیات اسلامی کی روشنی میں جدید مسائل میں اجتہاد واستنباط احکام کی صلاحیت کے حامل اور اس ذمہ داری کو پورا کرسکیں۔[1]

[1] آخرالہیات کتاب ''شفا بوعلی سینا''

تمدن اسلامی کے درخشاں دور میں جب کہ ایک وسیع اور بدوی مسلم معاشرہ ترقی وتوسیع کی جانب تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا اور اس نے ایشیا کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے بعض حصوں پر غلبہ حاصل کرلیا تھا اور گوناگوں نسلوں اور قوموں پر جن میں ہر ایک اپنا ایک خاص ماضی اور تہذیب رکھتی تھی ،اسے حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران ہزاروں جدید مسائل پیدا ہوئے۔مسلمان اس ذمہ داری سے بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔علماء اسلام نے ثابت کر دیا کہ اسلامی سرچشمے اپنی بہتر تشخیص اپنے بہتر استنباط سے ترقی وتکمیل کے مراحل سے گزرنے والے کسی بھی معاشرہ کے ساتھ چل سکتے ہیں اور اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ''اسلامی حقوق'' کا قانون یعنی (E I Y T L PROCEDURE) زندہ ہے اور زمانے کی ترقی سے پیدا ہونے والے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی کی قابلیت رکھتا ہے اور ہر دور کی ضروریات کا جواب دے سکتا ہے۔

مستشرقین اور ماہرین قانون جنہوں نے اس دور کی فقہ اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس حقیقت کے معترف ہیں اور حقوق اسلامی یعنی اسلام کے (EIYTL PROCEDURE) کو مستقل ''مکتب قانون'' کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور اسے ایک زندہ مکتب قانون قرار دیا ہے۔

ساتویں صدی ہجری تک اجتہاد کا حق محفوظ تھا اور اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا البتہ اس ساتویں صدی میں خاص تاریخی اسباب کی بنا پر شوریٰ اور اجماع کو بنیاد بنا کر علماء سے یہ حق سلب کرلیا گیا اور علماء ہمیشہ کیلئے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے علماء کے نظریات کا اتباع کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہیں سے چھ معروف مذاہب تک فقہی مذاہب کی تحدید وجود میں آئی۔

اجتہاد کے دروازے کا بند ہو جانا عالم اسلام کا ایک بڑا المناک حادثہ

سمجھا جاتا ہے۔شاید اجتہاد میں افراط کے سلسلے کے خلاف ردعمل کے طور پر ایسا ہوا ہو، بہرکیف فقہ اسلامی میں جمود اور ٹھہراؤ اسی وقت سے شروع ہوا۔

اجتہاد کے دروازے کے بند ہونے کے ناپسندیدہ اثرات اہل تشیع پر بھی مرتب ہوئے۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد شیعہ فقہ میں عمیق فکر ونظر پیدا ہوگئی تھی اور بعض شعبوں میں وسیع تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس فقہی سسٹم میں بھی چندصدی پہلے کی طرح مسائل کی تشریح کا رجحان اور وقت کے مسائل کا سامنا کرنے سے گریز اور جدید تر عمیق تر طریقوں کے دریافت کی جانب سے بے رغبتی واضح صورت میں نظر آتی ہے۔

نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ حالیہ صدیوں کے دوران تو جوانوں اور اصطلاحاً روشن فکر مسلمانوں کے طبقے میں مغرب کی میلان ،مشرقی واسلامی روایات کی نفی کا رجحان اور مغربی ''ازموں'' کی اندھی تقلید کا مرض پیدا ہوگیا ہے۔بدقسمتی سے یہ مرض بڑھتا جارہا ہے لیکن خوش نصیبی کا پہلو یہ ہے کہ ان اندھے اور خوابیدہ رجحانات کی تاریکی میں بیداری اور آگاہی کی ایک کرن بھی پھوٹ رہی ہے۔

اس خواب غفلت میں مبتلا کرنے والی گمراہی کی جڑ وہ غلط تصور ہے جو یہ گروہ اصطلاحاً اسلامی ضوابط کے تحکمانہ ،ادعائی (DOGMATIE) پہلو کے بارے میں رکھتا ہے ۔گزشتہ صدیوں کے دوران اجتہاد میں جمود نے ان غلط تصورات کو تقویت فراہم کی ہے۔قوم کے رہنماؤں اور ذمہ دار افراد کا فرض یہ ہے کہ جس قدر جلد ہوسکے علمی ومنطقی انداز میں اس طرح کے رجحانات کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔

اس صورت حال کے اسباب وعوامل کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں جس بات پر ہمیں پردہ ڈالنا چاہیے وہ یہ ہے کہ فکری جمود اور ٹھہراؤ گزشتہ صدیوں کے دوران عالم

اسلام پر مسلط رہا ہے۔خصوصاً اسلامی فقہ میں جمود ماضی کی طرف دیکھتے اور زمانے کی روح کو سمجھنے اور اس کا سامنا کرنے سے گریز ہماری اس ناکامی اور شکست کا ایک بڑا سبب سمجھا جاتا ہے۔آج عالم اسلام کو ہمیشہ سے زیادہ ایک ایسی قانون سازی کی تحریک کی ضرورت ہے جو ایک جدید وسیع اور ہمہ گیر نظر سے اسلامی تعلیمات کی گہرائی سے فیض حاصل کرے اور مسلمانوں کے دست وپا کو مغربی افکار ونظریات کے استعماری بندھنوں سے آزاد کرائے۔

قرآن بے پایان استعداد و وسعت کے اعتبار سے فطرت کی مانند ہے

فلسفہ کے موضوعات میں سے ایک حیرت انگیز موضوع کا تعلق اسلامی سرچشموں خصوصاً قرآن کریم کے مضامین میں تحقیق ،دریافت واستنباط کی کبھی ختم نہ ہونے والی استعداد ہے۔صرف فقہ اور حقوق کے مسائل ہی نہیں تمام شعبوں کے بارے میں یہی کہ جاسکتا ہے۔ ہرانسانی کتاب خواہ وہ ایک بڑا شاہکار ہی کیوں نہ ہو تحقیق ومطالعہ کیلئے اپنے اندر محدود استعداد اور ختم ہوجانے والی وسعت رکھتی ہے اور اس کتاب کے تمام نکات کو واضح کرنے کیلئے چند ماہرین کافی ہوسکتے ہیں لیکن قرآن نے جن پر گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران ہمیشہ سینکڑوں ماہرین تحقیق کام کرتے ہے یہ ثابت کردیا ہے کہ تحقیق واجتہاد کے نقطہ نظر سے وہ بے پناہ استعداد اور وسعت اپنے اندر رکھتا ہے قرآن اس اعتبار سے فطرت کے مانند ہے کہ جس قدر فکر ونظر وسیع تر اور عمیق تر ہوتی چلی جاتی ہے قرآن کے مضامین میں تحقیقات ومطالعہ کی پنہائی اور زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہے اور نئے سے نئے راز سامنے آتے

چلے جاتے ہیں۔مبداء ومعاد حقوق فقہ اخلاقی تاریخی قصص اور طبیعات سے متعلق جن مسائل کا ذکر قرآن میں آیا ہے اگر ان کا دقیق مطالعہ کرنے کے بعد چودہ صدیوں کے دوران ابھرنے والے اور پرانے ہوجانے والے نظریات کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو حقیقت پوری طرح روشن ہوجائے گی۔

فکر ونظر خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور وسیع تر عمیق تر ہوجائے وہ خود کو قرآن کے ساتھ ہم آہنگ پائے گی۔حقیقت یہ ہے کہ آسمانی کتاب کو جو ایک باقی رہنے والے معجزہ ہے ایسا ہی ہونا چاہیے۔

قرآن کے نزدیک سب سے بڑا دشمن جمود اور ایک خاص زمانے اور متعین مرحلے کے دانش پر انحصار کرنا ہے جیسا کہ علوم فطرت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہمارے علماء یہ سمجھتے تھے کہ فطرت کا علم وہی ہے جو ماضی میں ارسطو اور افلاطون وغیرہ جیسے افراد نے ترتیب دیا ہے۔

قرآن کے مفاہیم ہر زمانہ کے لوگوکیلئے تر و تازہ ہیں

قرآن کریم حتیٰ کہ خود رسول اکرمؐ کے جامع کلمات اپنے اندر تحقیق وکاوش کی بے پناہ وسعت رکھتے ہیں۔اس لئے نظروں کو محدود ہوکر نہیں رہ جانا چاہیے۔اول روز سے اسلام کے عظیم رہبر کی توجہ اس جانب رہی ہے اور آپ اسے اپنے اصحاب کے گوش گزار کرتے رہے ہیں۔رسول اکرمؐ نے بار بار اپنے کلمات میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن کو ایک خاص زمانے کی دانش وبینش کے ساتھ محدود نہ کرو۔آپؐ نے فرمایا:

''قرآن کا ظاہر خوبصورت اور اس کا باطن عمیق ہے جس کی ایک حد ونہایت ہے پھر اس کے اوپر ایک اور حد ونہایت ہے اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں

ہوں گے اور اس کی تازگیوں پر کبھی پژمردگی طاری نہیں ہوگی۔[1]

امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا:

یہ کیا راز ہے کہ قرآن کو لوگوں کے درمیان جس قدر پھیلایا جاتا ہے اور اسے پڑھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں بحث وفکر کی جاتی ہے اسی قدر اس کی طراوت وتازگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے؟

امامؑ نے جواب دیا:

''ایسا اس لئے ہے کہ قرآن کو ایک خاص عہد وزمان کیلئے اور کسی خاص قوم کیلئے نازل نہیں کیا گیا ہے،قرآن تمام زمانوں کیلئے اور تمام انسانوں کیلئے ہے۔اس اعتبار سے ہر وہ زمانے میں جدید ہے اور تمام لوگوں کیلئے ہر وقت تازہ ہے۔''[2]

رسول اکرمؐ جب اپنی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی تاکید فرماتے تھے تو اس میں یہ خاص نکتہ پوشیدہ تھا کہ شاید جس شخص نے آپؐ سے براہ راست آپ کی احادیث کو سنا ہو تفقہ سے بہرہ مند ہوا اور وہ کسی صاحب دانش وبینش تک انہیں منتقل کرنے کیلئے محض ایک رابطے کا کام دے یا پھر جو شخص آپ سے احادیث سنے وہ تفقہ سے بہرہ مند ہو لیکن اس کے ذریعہ جس شخص تک آپ کی کوئی

---

[1] ظاهره انيق وباطنه عميق له تخوم وعلى تخومه لاتحصى عجائسه ولاتبلى غرائبه (اصول کافی، ج2 ص599)

[2] مابال القرآن لايزيد بالنشر والدراسته الاغضاضة؟ قال (ع) لانه لم لزمان دون زمان ولاالناس دون ناس ولذالك ففى كل زمان جديد وعند كل ناس غض (عیوان اخبار الرضا۔ چاپ سنگی ص239)

حدیث پہنچے وہ حدیث پہنچانے والے سے زیادہ تفقہ کا مالک۔[1]

تاریخ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بعد کے زمانوں میں آنحضورؐ کی احادیث مفاہیم ومطالب کے سمجھنے میں پہلے سے زیادہ تفقہ سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔

اجتہاد کی اضافیت

ترقی وتکمیل کی طرف مسلسل بڑھنے والی دانش وبینش کا اثر کسی جگہ اس قدر محسوس نہیں کیا جاسکتا جس قدر کہ فقہی مسائل میں اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ فقہ اسلامی پر کئی دور گزر چکے ہیں ہر دور میں ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص دانش حکم فرما رہی ہے۔ آج کے استنباط کے قواعد اور اصول ہزار سال اور سات سو سال پہلے کے قواعد واصول سے مختلف ہیں۔ ایک ہزار سال پہلے کے علماء جیسے شیخ طوسی یقیناً ایک ممتاز مجتہد رہے ہیں اور لوگوں نے ان کی جو پیروی وتقلید کی ہے وہ صحیح ہے قدیم علماء کا طرز فکر ان کی ایسی کتابوں سے واضح ہے جو فقہ خصوصاً فقہ پر لکھی گئی ہے۔

شیخ طوسی کی اصول فقہ پر بعض کتابیں ان کے طرز تفکر کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔ یہ کتابیں آج بھی موجود ہیں۔

حالیہ ادوار کے فقہا پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ سابق طرز تفکر منسوخ ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ جدید تر عمیق تر اور وسیع تر دانش نے پرانے طرز فکر کی جگہ حاصل کرلی ہے جیسا کہ موجودہ دور میں سائنس، نفسیات اور قانون کے شعبوں میں علم ودانش نے فقہی مسائل میں زیادہ گہرائی کے امکانات پیدا کردیئے ہیں۔

[1] نصر الله عبداًسمع مقالتي فوعاها وبلغها من لم يسمعها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه (اصول کافی، ج1 ص402)

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ کیا اس سابق عہد کے علماء اپنے اس وقت کے تفقہ اور طرز فکر کے ساتھ مجتہد کے مقام پر فائز رہے ہیں؟ اور کیا وہ اس بات کے مستحق تھے کہ عوام ان کی تقلید کرتے اور ان کے تفقہ کو اسلامی ضوابط کی تشخیص وتدوین کا اہل اقرار دیتے؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا جائے گا۔

پھر اگر یہ سوال کیا گیا کہ موجودہ دور میں اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی کے بعد کی تمام کتابیں اور تالیفات اور آثار کو جوں کا توں قبول کرلے اور خود کو پانچویں صدی میں فرض کرے اور شیخ طوسی جیسے علماء نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ان ہی کا وہ بھی مطالعہ کرے اور وہ طرز فکر اور وہی تفقہ اپنے اندر پیدا کرے جو ان علماء نے اپنے اندر پیدا کیا تھا تو کیا وہ مجتہد کہلا سکے گا اور لوگوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کی تقلید کریں؟ اس کا جواب نفی میں دیا جائے گا۔ آخر ایسا کیوں؟ اس شخص کے درمیان اور پانچویں صدی کے لوگوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

فرق یہ ہے کہ ان علماء نے جس دور میں زندگی بسر کی تھی اس کی دانش وبینش اسی دور کے لئے تھی۔ یہ شخص ایسے عہد میں زندگی بسر کررہے ہیں جس میں ماضی کے اس طرز فکر وتفقہ کی جگہ ایک جدید تر طرز تفکر اور تفقہ نے لے لی ہے اور ماضی کا وہ طرز تفکر اب منسوخ ہوچکا ہے۔

اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ اجتہاد ایک اضافی اور تکاملی مفہوم رکھتا ہے اور ہر دور ایک مخصوص دانش وبینش پیدا کرتا ہے۔ یہ اضافت دو چیزوں سے ختم ہوجاتی ہے۔ کشف وتحقیق کے لئے اسلامی سرچشموں کی بے پایان وسعت وصلاحیت اور دوسرے انسانی افکار اور علوم طبیعی کی تکمیل خاتمیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

❁❁❁❁❁